فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (20)

سہ ماہی

تاریخ

پنجاب نمبر

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

مشاورتی بورڈ

قاضی جاوید

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سعود الحسن خان

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور

مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط وکتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: 6665997
ای میل: .lena@brain.net.pk

خط وکتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز ☚ فکشن ہاؤس
☚ 18- مزنگ روڈ لاہور
فون ☚ 7249218-7237430
قیمت فی شمارہ ☚ 100 روپے
سالانہ ☚ 400 روپے
قیمت مجلد شمارہ ☚ 150 روپے
بیرون ممالک ☚ 2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)
رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان
اہتمام ☚ ظہور احمد خاں
کمپوزنگ ☚ فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس سنٹر لاہور
پرنٹرز ☚ حاجی حنیف پرنٹرز لاہور
سرورق ☚ عباس
تاریخ اشاعت ☚ جنوری 2004ء

فہرست

تاریخ کانفرنس 7

مضامین

خطبہ استقبالیہ ڈاکٹر مبارک علی 11
پیڑاں والی: دریائے راوی کی متروک گزرگاہ کے کنارے ایک ہڑپائی ٹیلہ زبیر شفیع غوری 18
پنجاب کے قدیم باشندے اشفاق سلیم مرزا 43
چولستان: مختصر تعارف محمد افضل مسعود 64
پنجاب میں مزارات اور اُن کا فنِ تعمیر غافر شہزاد 76
پنجاب کا ابتدائی برطانوی دور: آبادکاری اور نہری نوآبادیاں پرویز وندل/سعود الحسن خان 88
جدید پنجاب کی تشکیل اور مستشرقین کا کردار ندیم عمر 100
یونینسٹ پارٹی اور فضل حسین کا کردار طاہر کامران 108
محکومی کی سیاست کا شکار: مغربی پنجاب کا ایک گاؤں حمزہ علوی 126

تحقیق کے نئے زاویئے

نمک کی تاریخ ڈاکٹر مبارک علی 159

نقطہ نظر

اکبرنامہ میں تاریخی نویسی کا اسلوب اور تاریخی تعلیل (خصوصی مقالہ) برائے ہربنس مکھیا/رشید ملک 167
تبصرہ کتب 197

تاریخ کے بنیادی مآخذ

سفرنامہ بَن گڑھ

مصنف: رائے رایان آنندرام مخلص

ترجمہ وحواشی: سعود الحسن خان روہیلہ

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

حمزہ علوی کی یاد میں

حمزہ علوی

(1921-2003)

پروفیسر حمزہ علوی 10-اپریل 1921ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سندھ مدرسہ اور ڈی۔ جے کالج میں حاصل کی۔ اس کے بعد واڈیہ کالج پونہ اور علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے (علی گڑھ یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی)۔

ملازمت کی ابتداء ریزرو بنک آف انڈیا، بمبئی سے کی، تقسیم کے بعد پاکستان چلے آئے اور یہاں اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازمت کی۔ 1953ء میں اسٹیٹ بنک کی ملازمت چھوڑ کر تنزانیہ چلے گئے جہاں کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔ لیکن اس میں دل نہ لگا، اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن چلے گئے جہاں وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے مگر ساتھ ہی میں انہوں نے معیشت، سوشیولوجی اور انتھراپولوجی میں تحقیق کی اور اکیڈمی سرکل میں اپنے خیالات کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ انہوں نے بحیثیت استاد کے، سے سیکس، لیڈز، مانچسٹر، کیلی فورنیا، ڈینور اور مشی گن یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔

وہ جنرل آف کن ٹم پوریری ایشیا (Journal of Contemporary Asia) اور جنرل آف پے زینٹ اسٹڈیز (Journal of Peasant Studies) کے بانی رکن تھے۔

اردو میں ان کے مضامین کے تراجم سہ ماہی تاریخ میں شائع ہوتے رہے۔ ادارہ فکشن ہاؤس نے ان کی دو کتابیں ’’جاگیرداری اور سامراج‘‘ اور ’’پاکستان: ریاست اور اس کا بحران‘‘ شائع کی ہیں۔

وہ سہ ماہی تاریخ کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن تھے۔ ان کی وفات یکم دسمبر 2003ء کو کراچی میں ہوئی۔

تاریخ کانفرنس

سہ ماہی تاریخ اور فکشن ہاؤس کی جانب سے پانچویں تاریخ کانفرنس 12-اکتوبر 2003ء کو نیشنل کالج آف آرٹس کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ اس شمارے میں وہ مقالات شامل ہیں کہ جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے۔ مقالہ نگاروں میں زبیر شفیع غوری، اشفاق سلیم مرزا، قاضی جاوید، غافر شہزاد، ندیم عمر، پرویز وندل، طاہر کامران اور رضوان عظیم شامل تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی
جنوری 2004ء
لاہور

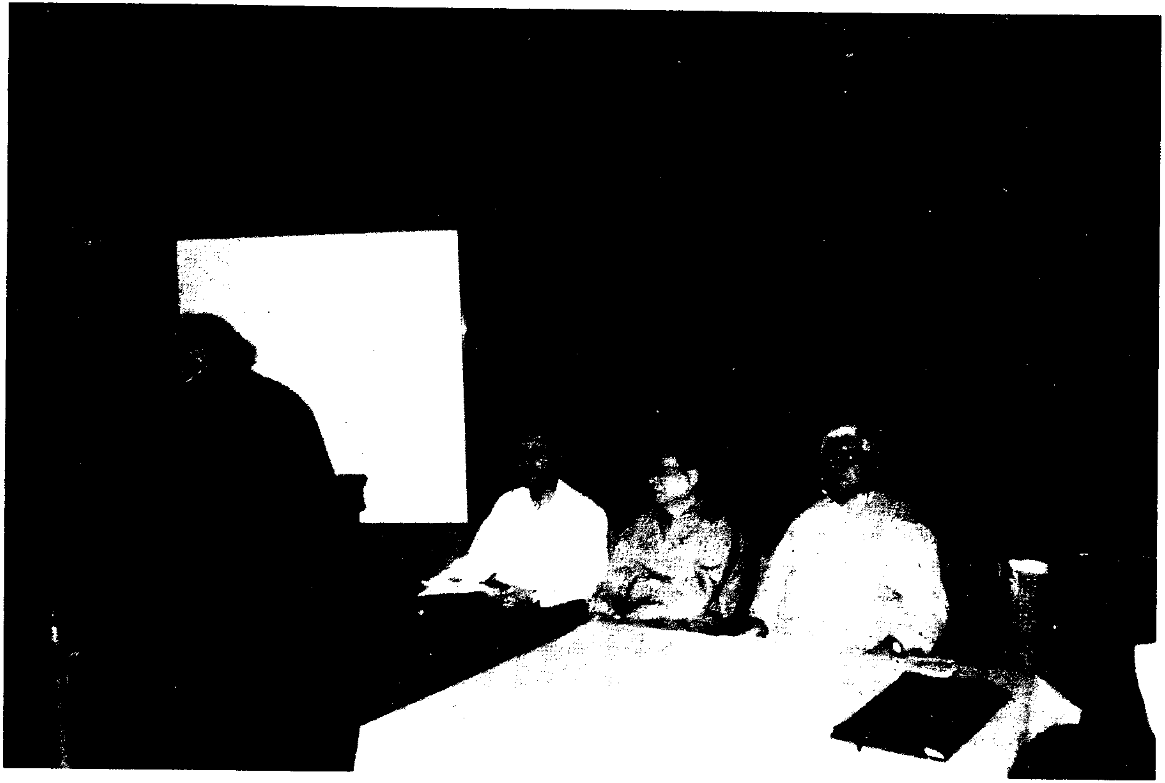

سٹیج پر افضل مسعود، ڈاکٹر مبارک علی، حیدر جاوید سید، اشفاق سلیم مرزا اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے

مضامین

خطبہء استقبالیہ

ڈاکٹر مبارک علی

ماضی کے بارے میں جاننے کا تجسس اور شوق تقریباً ہر ایک ہی کو ہوتا ہے۔ اس لئے تاریخ یہ فریضہ سرانجام دیتی ہے کہ وہ ماضی کی تشکیل کرے اور اس کی معلومات فراہم کرے۔ اگر کسی معاشرے میں طاقت و اقتدار چند گروہوں اور جماعتوں کے پاس ہوتا ہے تو اس صورت میں تاریخ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے خود کو محدود کر لیتی ہے۔ لیکن اگر اختیارات معاشرے کے اداروں میں پھیل جاتے ہیں اور طاقت کسی ایک فرد یا ادارے میں سمٹ کر نہیں رہتی ہے تو اس صورت میں تاریخ کا دائرہ کار بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ معاشرے کی اکثریت کی نمائندگی کرنے لگتی ہے۔ اس ضمن میں اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ اس لئے ایک محدود اور پابند دائرے میں ہے کیونکہ طاقت و اقتدار ابھی چند طبقوں اور اداروں کے پاس ہے۔ اب ہم بادشاہوں اور حکمرانوں کے بجائے فوج، جاگیرداروں، اور بیوروکریسی کی تاریخ لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اس تاریخ سے عوام اور ان کے رول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس وہ کون سے ذرائع ہیں کہ جو ہمیں تاریخی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں اولین طور پر ہم داستانوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن میں نیم تاریخی قصے و واقعات کو خوبصورت اور دلنواز انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ الف لیلیٰ اگرچہ ایک داستان ہے، مگر اس میں عہد عباسیہ کی سماجی اور ثقافتی تاریخ جھلکتی ہے۔ راجہ بکر ماجیت کی کہانیاں، گپت خاندان کے اس حکمراں کے عدل و انصاف سے بھرپور ہیں۔ داستانوں کے

ذریعہ لوگوں میں ماضی سے آگہی تو ہوتی ہے، مگر یہ آگہی حقائق پر مبنی واقعات پر نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس میں تفریح کا پہلو ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ان خواہشات کی عکاسی کہ لوگ خوش حال اور امن و آشتی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

انہیں داستانوں نے آگے چل کر تاریخی ناولوں کی شکل اختیار کر لی۔ اردو میں اس صنف کو مقبولیت دینے میں عبدالحلیم شرر کا بڑا حصہ ہے۔ ان ناولوں کے لئے انہوں نے ایک فارمولا وضع کیا تھا کہ جس میں مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہوتی تھی، مسلمان ہیرو، عیسائی حسینہ سے آخر میں شادی کر کے ناول کا طربیہ کے انداز میں اختتام کرتا تھا۔ ان کے ناولوں کے پس منظر کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ہندوستانی مسلمان اپنی سیاسی طاقت و اقتدار عیسائیوں کے مقابلہ میں کھو چکے تھے۔ اب اس فتح کو ناولوں کے اندر اور ماضی میں ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان ناولوں کی مقبولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کو انہوں نے کافی ذہنی سکون مہیا کیا تھا۔

شرر کے اس اسلوب کو آگے چل کر صادق صدیقی سردھنوی نے اختیار کیا اور تقریباً 150 ناول لکھ کر اپنے زمانہ میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ اسلوب آج بھی مختلف تاریخی ناول اور افسانے لکھنے والوں میں پسندیدہ ہے اور ان کی تحریریں ڈائجسٹوں اور رسالوں میں چھپ کر بڑی تعداد میں پڑھی جاتی ہیں۔

تاریخی ناول نگاری میں اس اسلوب سے ہٹ کر جنہوں نے ایک نئے انداز کو اختیار کیا وہ نسیم حجازی تھے۔ ان کے ناولوں میں جہاں ایک طرف فتوحات و کامیابیاں ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہی اسلامی معاشرے کے زوال کا المیہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تقسیم ہند کے اثرات پر بھی لکھا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ ہندو دشمنی کو بھی اجاگر کیا۔

ان تاریخی ناولوں سے جو تاریخی شعور حاصل ہوتا ہے، وہ یہ کہ قوموں کی کامیابی و فتح مندی کے لئے فوجی قوت و طاقت کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ اگر دینی حمیت و غیرت ہو تو مسلمانوں کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ مسلمان معاشرے کا زوال اس لئے ہوا کہ وہ دین سے دور ہوئے، آپس میں فرقہ بندی کے ذریعہ اتحاد کو کھویا، جس کی وجہ سے بالآخر عیسائیوں، یہودیوں، اور ہندوؤں کی سازشوں میں گھر کر تباہ ہو گئے۔ یہ وہ تاریخی شعور ہے کہ جو معاشرے کے اکثر لوگوں

کے ذہن میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

تاریخی معلومات کا ایک اور ذریعہ فلم اور ڈرامہ ہے۔ اب تک جو تاریخی فلمیں بنائی گئی ہیں، ان میں سوائے چند کے جن میں سہراب مودی کی سکندر اور جھانسی کی رانی قابل ذکر ہیں، باقی فلموں کی کہانیوں کا تعلق تاریخی حقائق سے نہیں ہے بلکہ زیب داستاں کے لئے کہانی نویس نے واقعات کو بھی مسخ کیا اور حقائق سے بھی روپوشی کی۔ اس کی ایک مثال انارکلی کا ڈرامہ ہے، جس کی تاریخی حیثیت تو کوئی نہیں، مگر عوام میں اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک کنیز کی بغاوت اور ایک حکمراں کا جبر ہے۔ اکبر جو کہ تاریخی حیثیت میں ایک روشن خیال حکمراں تھا اس میں ایک تنگ نظر اور ظالم کے روپ میں اُبھرتا ہے۔ شاید اس کے کردار عوام کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں، اسی لئے وہ انہیں پسند کرتے ہیں۔ یہ تاریخی شعور، اس فرضی تاریخ پر ہوتا ہے کہ جو تخیل کی پیداوار ہوتی ہے اور جس میں جذبات و احساسات کو اُبھار کر اس سے کمرشل فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔

تاریخی شعور پیدا کرنے میں شاعری کا بھی بڑا دخل ہے۔ اردو میں الطاف حسین حالؔی کی ''مد و جذر اسلام'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں مسلمانوں کے عروج کی داستان بھی ہے تو ان کے زوال کا المیہ بھی۔ شبلی نے کچھ نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کے دور حکومت کی شان و شوکت کو اجاگر کیا، تو اقبال کے ہاں ماضی کی عظمت جگہ جگہ ان کے اشعار میں دلوں کو گرماتی نظر آتی ہے۔ حفیظ جالندھری کی ''شاہنامہ اسلام'' کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ شاعری کے ذریعہ جس تاریخ کی تشکیل کی گئی، اور اس سے جو تاریخی شعور اُبھرا، اس میں دور عروج کی عظمت سے فخر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، تو زوال ایک المیہ کی شکل میں اُبھر کر آتا ہے جو بے بسی اور مجبوری کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہ تاریخی شعور کوئی ایسا راستہ نہیں نکالتا کہ جس کے ذریعہ زوال کے چکر سے آزاد ہوا جائے۔ یہ یا تو دعاؤں پر ختم ہوتا ہے، یا خدا سے شکایتوں پر۔

تاریخ نویسی میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب مغربی تعلیم کے ذریعہ تحقیق کے فن کو سیکھا

گیا۔ یورپی تعلیم یافتہ مورخوں نے تو انگریزی کو اظہار کا ذریعہ بنایا، اور اردو میں مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہند تو لکھی، مگر اس میں پرانے اسلوب کو برقرار رکھا، یعنی قدیم ماخذوں سے مواد کو اکٹھا کر دیا مگر اس کا تجزیہ نہیں کیا۔ محمد حسین آزاد، مولوی چراغ علی، اور شبلی، ان چند مورخوں میں سے ہیں، جنہوں نے اردو میں تاریخی موضوعات پر لکھا۔ اردو میں لکھنے والے اکثر مورخوں نے جب اسلامی تاریخ لکھی تو اسے عقیدت کے ساتھ، ثواب کی غرض سے لکھا۔ اس لئے ان کے ہاں تجزیہ اور تنقید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''تاریخ اسلام کا سفر'' مصنف سید علی اکبر رضوی کی کتاب کے بارے میں ایک ریویو میں کہا گیا ہے کہ

''سید علی اکبر رضوی کی کتاب بڑی عقیدتمندی سے لکھی گئی ہے۔'' لہٰذا جو تاریخ عقیدت مندی اور ثواب کی غرض سے لکھی جائے گی، اس سے پیدا ہونے والے تاریخی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا صحیح تاریخی شعور کو پیدا کرنے، اور اسے اُبھارنے کے لئے ایسی تاریخ نویسی کی ضرورت ہے کہ جو تجزیاتی اور تنقید سے بھرپور ہو۔ ایک ایسی تاریخ کہ جو اہل اقتدار تک محدود نہ ہو، بلکہ اس کے دائرے میں پورا معاشرہ اور اس کے طبقے ہوں۔

تاریخ نویسی میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسے نئے مواد اور نئے خیالات و افکار کی روشنی میں بار بار لکھا جائے۔ اسکالرشپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے برابر متحرک رہتے ہوئے آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ اگر تحقیق ایک جگہ ٹھہر کر رہ جائے گی تو اس کے ساتھ ہی تاریخی شعور بھی ٹھٹھر کر جامد ہو جائے گا۔ ہر نسل کو اپنے وقت اور تقاضوں کے تحت تاریخ کی نئی تعبیر اور تفسیر چاہئے ہوتی ہے۔ اس لئے تاریخ کو وقت اور زمانہ کے مطابق نئے انداز اور اسلوب میں ڈھالتے رہنا چاہئے۔

اسی کا احساس کرتے ہوئے کہ تاریخ نہ صرف معاشرے کی نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، بلکہ یہ سماجی داستاں اور معاشی مسائل کے بارے میں ادراک بھی دیتی ہے۔ 1998ء میں چند دوستوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ تاریخ پر ایک سہ ماہی جرنل شائع کیا جائے جس میں تاریخ اور

تاریخ نویسی کے بارے میں اپنے مضامین و مقالات شائع کئے جائیں کہ جن سے اس مضمون کی اہمیت کا احساس ہو۔ چنانچہ اس کا پہلا شمارہ فروری 1999ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد سے اب تک پابندی سے اس کی اشاعت ہو رہی ہے، اور ہم اب تک اس کے 19 شمارے شائع کر چکے ہیں۔ اس کی اشاعت میں جن دوستوں نے تعاون کیا ان میں سعود الحسن خان، طاہر کامران، چوہدری ظہور، غافر شہزاد، ظفر علی خاں، پرویز وندل، قاضی جاوید، اور طارق عزیز سندھو قابل ذکر ہیں۔

تاریخ کے ان ہی شماروں میں پہلی مرتبہ حمزہ علوی کے مضامین کے تراجم شائع ہوئے، جو بعد میں ''جاگیرداری و سامراج'' اور ''پاکستان: ایک ریاست کا بحران'' میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔

اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ تاریخ کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ پہلی تاریخ کانفرنس 15- اکتوبر 2000ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس کا موضوع تھا ''پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل''۔ اس کی صدارت حمزہ علوی نے کی۔ مقالات پڑھنے والوں میں عطیہ خان، قاضی جاوید، طاہر کامران، ندیم عمر اور مبارک علی تھے۔

دوسری کانفرنس 14- اکتوبر 2001ء میں لاہور میں ہوئی، اس کا موضوع ''لاہور شہر'' تھا۔ مقالات پڑھنے والوں میں سعود الحسن خان، سجاد کوثر، پرویز وندل، غافر شہزاد، ندیم عمر، اور مبارک علی تھے۔

تیسری کانفرنس 17- مارچ 2002ء کو ہوئی، اس کا موضوع ''پنجاب اور سکھ تاریخ'' تھا، اُس کانفرنس میں مضامین پڑھنے والوں میں قاضی جاوید، پرویز وندل، غافر شہزاد، عمر کمال خاں، طاہر کامران اور مبارک علی تھے۔

چوتھی کانفرنس 20- اکتوبر 2002ء میں حیدر آباد سندھ میں ہوئی، اس کا موضوع ''تاریخ سندھ'' تھا، اس میں مقالات پیش کرنے والوں میں تنویر جونیجو، اعجاز قریشی، پرویز وندل، قاضی جاوید اور مبارک علی تھے۔ ان کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات تاریخ کے شماروں میں شائع کئے جاتے رہے۔

یہ پانچویں کانفرنس پنجاب کی تاریخ پر ہے۔ تاریخ کے جرنل کی اشاعت پر ہم نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ علاقائی تاریخ پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ مگر بدقسمتی سے ہمیں اس سلسلہ میں معیاری مضامین موصول نہیں ہوئے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ پاکستان میں علاقائی تاریخ اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ اس پر بہت کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں جو مسائل ہیں وہ یہ کہ مرکزی حکومت اور مرکزی اداروں سے بیزار ہو کر، علاقائی نیشنل ازم کی جو تحریکیں اُبھریں انہوں نے تاریخ نویسی کو بھی متاثر کیا۔ نیشنل ازم کے تحت جب بھی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اول اس میں ہیروز کو تلاش کیا جاتا ہے، دوئم علاقائی کلچر اور اس کی روایات کو زندہ کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں عناصر بڑے نازک ہوتے ہیں۔ مثلاً کون سی شخصیتوں کو بطور ہیرو پیش کیا جائے؟ اگر یہ حکمراں، فوجی جرنل، امراء، اور بالادست طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، تو اس سے فائدہ بھی یہی لوگ اور طبقے اٹھائیں گے۔ اسی طرح اگر علاقائی روایات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے، تو اس میں بھی خطرہ ہے کیونکہ ہر روایت تو ترقی پسند اور روشن خیال نہیں ہوتی ہے۔ ان میں فرسودہ اور مسخ شدہ روایات بھی ہوتی ہیں کہ جن کو ختم کرنا ترقی کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا علاقائی تاریخ نویسی میں ان اُلجھنوں کو دیکھنا ضروری ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ شخصیتوں کو ہیرو بناتے وقت ان کے کردار کا تجزیہ ضروری ہے۔ مثلاً سندھ میں جب راجہ داہر کو ہیرو قرار دیا گیا تو پنجاب میں پورو یا پورس کو ہیرو بنایا گیا۔ ہمارے پاس پورس کے بارے میں ساری معلومات یونانی مورخوں کے مواد پر ہیں۔ اس لئے اگر اس کا بغور تجزیہ کیا جائے کہ پورس نے سکندر سے کہا کہ "میرے ساتھ وہی سلوک کرو کہ جو بادشاہ بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے" تو اس میں بڑائی سکندر کی ہے کہ جس نے فیاضی دکھاتے ہوئے اسے معاف کر کہ وہ اس کا قیدی تھا۔ سکندر کی اس فیاضی اور دریا دلی کے لئے پورس کا جرأت ..دما سروری تھا۔

پنجاب کی تاریخ کے سلسلہ میں ایک نکتہ پرویز وندل نے اٹھایا کہ جب عہد برطانیہ میں نہری کالونیز کے لئے مشرق پنجاب سے آبادکاروں کو لایا گیا، تو انہوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو "جانگلی" کہہ کر انہیں پس منظر میں دھکیل دیا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ تجزیہ کیا جائے کہ ان لوگوں پر اس کے کیا اثرات ہوئے؟ اور اس تفریق نے معاشرے کو کیسے اور کس طرح متاثر

کیا؟

آخر میں، میں فکشن ہاؤس کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون سے سہ ماہی تاریخ کی پابندی سے اشاعت ہو رہی ہے، اور ہر تاریخ کانفرنس میں ان کا تعاون شامل رہتا ہے۔ پاکستان میں شاید ان کی پہلی مثال ہے کہ جنہوں نے کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ، علمی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں عملی حصہ لیا۔

میں آپ سب لوگوں کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

* * * * *

پیڑاں والی: دریائے راوی کی متروک گزرگاہ کے کنارے ایک ہڑپائی ٹیلہ

زبیر شفیع غوری

عظیم تر وادی سندھ کی تہذیب کے حوالے سے دریائے سندھ اور اس کے معاونین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دریائے سندھ، راوی، بیاس اور ستلج کے کنارے زمانہء ماقبل تاریخ سے تعلق رکھنے والی کئی آبادیوں کے آثار سامنے آچکے ہیں۔ کوہستان نمک میں واقع کچھ آبادیوں کو دریائے جہلم جبکہ تھل کے صحرائی علاقے میں موجود بستیوں کو دریائے چناب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ دریائے ہاکڑہ کے کناروں پر ملنے والی قدیم بستیوں کو چھوڑ کر پنجاب کے باقی حصوں میں اٹھاون کے قریب ایسے اثری ٹیلے دریافت ہو چکے ہیں جو ہاکڑہ، ابتدائی ہڑپائی، عروج یافتہ ہڑپائی یا متاخر ہڑپائی دور کے عکاس ہیں۔ سرائے کھولا اور وھواڈھیرہ کی نچلی تہیں ان ادوار سے قدیم تر یعنی Neolithic دور کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ صوبہ پنجاب کی موجودہ حدود کے اندر دریائے سندھ کے کنارے تین، ٹیکسلا کے نواح میں پانچ، کوہستان نمک میں گیارہ، تھل میں سات، دریائے راوی کے کنارے بارہ جبکہ دریائے بیاس کی قدیم گزرگاہ کے ساتھ بیس قدیم آبادیوں کے آثار واقع ہیں۔ ان اثری ٹیلوں میں سے محض چار یعنی ہڑپہ، جلیل پور، سرائے کھولا اور ہتھیال میں کھدائی کے نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں۔ جبکہ باقی تمام کے تمام ٹیلے ہنوز کسی باقاعدہ تحقیقی کاوش کے منتظر ہیں۔ اس حوالے سے فکر کی بات یہ ہے کہ ان ٹیلوں میں سے کئی نابود ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں اور قوی امکان ہے کہ تخریب کے عناصر یونہی فعال رہے تو آنے

والے چند سالوں میں دس سے پندرہ ٹیلے ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ ٹیکسلا کے نواح میں ہتھیال، جنگ باہتر، پنڈ نوشہری، راوی کے کنارے کھڈاں والا، کچا پنڈ اور بیاس کے ساتھ چشتی والا، بھڑ کی، 18 ایم، 21 ایم، 27 ایم اور 29 ایم اس خطرے سے دوچار ٹیلوں کی اہم مثالیں ہیں۔ کوہستان نمک میں واقع زیادہ تر Sites بھی اسی فہرست میں آتی ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ ٹیلے زمانے ماقبل تاریخ کے انسان کی تہذیب اور تمدن کے مدفن ہیں۔ ان کا مطالعہ عمیق نظری اور قرینے سے کیا جائے تو یہ انسان سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں جس طرح ایک کتاب۔ یہ اپنے ماحول، باشندگان اور عروج وزوال کی کہانی بڑے بے لاگ اور بے باک انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا دائرہ کار بھی نہایت وسیع ہے۔ کتابوں کے برعکس یہ ہر طبقے اور ہر سطح کے لوگوں کا ماجرا سناتے ہیں اور اپنی رہت سہت کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ رائج الوقت نظریات کے تحت لکھی جانے والی کتابیں ان سے ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتیں۔

آج کی گفتگو کے حوالے سے دریائے راوی کی متروک گزرگاہ کے کنارے واقع ایک اہم اثری ٹیلے ''پیڑاں والی'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

یہ اہم اثری ٹیلہ ننکانہ صاحب، شاہ کوٹ روڈ پر ننکانہ سے شاہ کوٹ کی جانب جاتے ہوئے تقریباً نو کلومیٹر کے فاصلے پر بجانب جنوب مغرب برلب سڑک واقع ہے۔ شاہ کوٹ سے اس کا فاصلہ 19 کلومیٹر کے قریب ہے۔ پختہ سڑک کے بالکل ساتھ ہونے کی وجہ سے کسی بھی موسم میں اس تک رسائی ممکن ہے۔ عرض بلد 31 28' 30" اور طول بلد 73 37'00" پر واقع اس ٹیلے کو پیڑاں نامی ایک سکھ عورت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس نے نواح میں آباد گاؤں پیڑاں والی میں ایک باؤلی تعمیر کرائی اور اس کار خیر کے حوالے سے امر ٹھہری۔ بعہد حاضر یہ ٹیلہ مشترکہ کھاتے میں شامل ہے اور اس کے تقریباً نصف حصے پر ایک مسلم قبرستان بنایا گیا ہے۔

ٹیلہ اندازاً 14/5 ایکڑ رقبے کا احاطہ کرتا ہے۔ بتدریج اونچائی کی طرف مائل ہوتے ہوئے یہ اپنے بلند ترین مقام پر 13/14 فٹ کی اونچائی تک پہنچتا ہے۔ ٹیلے کی چہار جانب آباد رقبے ہیں اگرچہ شمالی جانب پختہ سڑک مزروعہ زمینوں اور اس کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ٹیلے کا تعلق ہے شمالی سمت سے لے کر اس کا تقریباً نصف حصہ قبرستان پر مشتمل ہے اور یہی وہ حصہ ہے

جو ٹیلے کا مطالعہ کرتے ہوئے بالعموم سب سے پہلے اس حوالے سے توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے کہ عہد ماقبل تاریخ کے گلی کوزہ جات کے جو ٹکڑے قبور پر اس غرض سے رکھے گئے ہیں کہ بارشوں کے موسم میں ان کی مٹی بہنے سے محفوظ رہے ان کے مطالعہ کے نتیجے میں بعض اتنے خوبصورت اور اہم سفالی ٹکڑے سامنے آتے ہیں جن کا دستیاب ہونا، باقاعدہ کھدائی کئے بغیر، تقریباً ناممکن ہے۔

ٹیلے کی سطح سے ملنے والی پاٹری اگرچہ ھاکڑہ، کوٹ ڈجی اور ہڑپائی ادوار کی عکاس ہے لیکن سب سے زیادہ ملنے والی ٹھیکریاں کوٹ ڈیجی دور سے متعلق ہیں۔ ان میں بناوٹ اور سجاوٹ کے لحاظ سے ایسی دیدہ زیب ٹھیکریاں دستیاب ہوتی ہیں کہ دست کار کے ہنر کی داد بے ساختہ دینے کو دل چاہتا ہے جس نے اپنے خون جگر کو کوزہ گری کی نذر کر دیا۔

ٹیلے کا جنوبی اور جنوب غربی حصہ اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اس کی سطح کا عمومی مشاہدہ کرنے اور بارشوں کے نتیجہ میں پڑنے والی دراڑوں کا خصوصی مطالعہ بڑا دلچسپ اور فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ بعض چھوٹی چھوٹی مگر اہم اشیاء ملنے کا امکان ان دراڑوں میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا یا بڑا کراس سیکشن مہیا کرنے والی ان دراڑوں کا مطالعہ اس حوالے سے بھی اہم ہوتا ہے کہ باقاعدہ کھدائی کئے بغیر سطحی مطالعے کے دوران ایک یا زائد تہوں کو اپنی اصل حالت میں دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

ہڈیوں کی خاصی بڑی تعداد جنوب غربی حصے میں بکھری نظر آتی ہے۔ گمان ہے کہ یہ حصہ دریا کی گزرگاہ کے قریب ہونے کی وجہ سے شکار کرنے والوں کے لئے اپنے شکار سے لطف اندوز ہونے کے بعد باقیات تلف کرنے اور اوزار وغیرہ صاف کرنے کی غرض سے استعمال ہوتا ہوگا۔ یہ رائے اس وجہ سے بھی تقویت پاتی ہے کہ دریا کی متروک گزرگاہ کے کنارے مارٹن پور کے اثری ٹیلے پر بھی ہڈیوں کے حوالے سے یہی صورت حال دیکھنے میں آتی ہے۔ بہرحال حتمی رائے اسی وقت قائم کی جاسکتی ہے جب ان ہڈیوں کا محتاط مطالعہ کرنے کے بعد اس امر کا تعین کیا جائے کہ یہ کن جانوروں کی ہیں اور کیا یہ جانور شکار کے نتیجہ میں اس جگہ پہنچے یا یہ ان جانوروں میں سے تھے جن کو سدھانے یا پالنے کا عمل اس ماحول میں جاری وساری تھا۔

ٹیلے کے جنوب غربی حصہ سے ایک دو اینٹیں بھی دستیاب ہوئیں جو کسی باقاعدہ سانچے کی

مدد کے بغیر ہاتھوں سے بنائی گئی ہیں۔ اگرچہ ان کی ساخت ماہرانہ نہیں لیکن ان کو اچھی طرح پکایا گیا ہے۔ ان کی موٹائی پونے تین انچ کے قریب، چوڑائی سوا نو انچ سے ساڑھے نو انچ تک جبکہ لمبائی بارہ انچ کے قریب تھی۔

اینٹوں کا کوئی مکمل، نامکمل، باقاعدہ یا بے قاعدہ سٹرکچر ٹیلے پر دیکھنے میں نہیں آیا لیکن اینٹوں کی موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ عمارت، گلیاں یا کوئی پختہ تعمیر یقیناً موجود رہی ہوگی۔ جو اینٹیں سطح پر ہوں گی وہ مقامی لوگوں نے کسی نہ کسی دور میں استعمال کی غرض سے نکال لی ہوں گی جبکہ باقی ماندہ کا مطالعہ کرنے کے لئے لازم ہے کہ اثری ٹیلے کی باقاعدہ کھدائی کی جائے۔

ٹیلے کے مطالعے کے دوران بعض مقامات پر جلی ہوئی سطح بھی دیکھنے والے کو دعوت فکر دیتی ہے۔ آبادیوں کے اجڑنے اور ہڑپائی تہذیب کے زوال کے حوالے سے بہت سے سوالات ہنوز جواب طلب ہیں۔ اگر یہ واضح ہو جائے کہ آبادی کی مفروضہ تباہی یا سوختگی کس دور میں عمل میں آئی اور اس سے پہلے یا بعد میں ہونے والی اختیاری یا غیر اختیاری نقل مکانی حتمی طور پر کس وجہ سے ہوئی تو کئی اہم انکشافات کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے آبادی کے ان سوختہ حصوں کا جائزہ سائنسی بنیادوں پر لینا ضروری ہے تاکہ اس امر کا تعین کیا جا سکے کہ کیا یہ آثار عہد ماقبل تاریخ سے متعلق باشندوں کی کسی صنعتی یا گھریلو سرگرمی کی باقیات ہیں یا متاخر ہڑپائی دور کے بعد کے عہد میں رونما ہونے والے کسی واقعہ کے نتیجہ کے طور پر نظر آتے ہیں۔

آیئے اب اس ٹیلے کے سطحی مطالعہ کے نتیجہ میں سامنے آنے والی کچھ اہم اشیاء کا جائزہ لیتے ہیں۔

ٹیلے سے ملنے والے گلی کوزہ جات میں سب سے قدیم ان سفالی برتنوں کی ٹھیکریاں ہیں جو ہاکڑہ دور سے متعلق ہیں۔ پیڑاں والی کے نواح میں واقع ایک اور اہم قدیم آبادی نولاں سے اس عہد کے بہت سے برتن دستیاب ہوتے ہیں۔ پیڑاں والی میں ھاکڑہ دور کے برتن اس تعداد میں تو نہیں ملتے جس طرح متذکرہ بالا آبادی سے ملتے ہیں لیکن اس دور کی نمائندگی کچھ نہ کچھ برتن ضرور کرتے ہیں۔ یہ برتن چاک کی مدد سے نہیں بنائے گئے جس وجہ سے ان کی بیرونی اور اندرونی سطح کسی حد تک ناہموار ہے۔ اس ناہمواری کا اندازہ سرسری طور پر دیکھنے سے نہیں لگایا جا سکتا ہے البتہ

بغور مشاہدے یا ہاتھ سے برتن کا لمس محسوس کرنے سے فوری طور پر یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ برتنوں کی رنگت مختلف درجے میں سرخی مائل ہے۔ ان پر کسی قسم کی آرائشی تہہ یا Slip نظر نہیں آتی البتہ کچھ مثالیں ایسی ملتی ہیں جن پر دہانے یا اس کے ساتھ ساتھ کچھ نیچے سیاہ افقی لکیریں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان لکیروں میں دست کار کی ابتدائی ناتجربہ کاری جھلکتی نظر آتی ہے۔ البتہ یہ حقیقت مدنظر رہنی چاہئے کہ کوٹ ڈیجی عہد میں فن کی یہی ناپختگی قابل داد حد تک چابک دستی میں بدل گئی، جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مقامی دست کار ارتقاء کی منازل مسلسل طے کرتے ہوئے کوزہ گری کے فن میں ہونے والی ہم عصر تبدیلیوں سے پوری طرح آگاہ رہا۔

دریائے راوی کی قدیم گزرگاہ کے ساتھ واقع آبادیوں میں جھری دار یا Grooved برتنوں کی سب سے خوبصورت مثالیں پیڑاں والی میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کوٹ ڈجی عہد کی نمائندہ یہ ٹھیکریاں اگرچہ اپنی مخصوص ہیئت کے باوصف ہنرمند کو اپنے فن کے اظہار کے لئے زیادہ کھلا میدان فراہم نہیں کرتیں لیکن اس کے باوجود کوزہ گروں نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے بہت سے تجربے کئے ہیں جن کے نتیجے میں ظروف کی خوبصورت مثالیں سامنے آئی ہیں۔ اس طرز خاص کے برتنوں پر بنی ہوئی افقی لکیریں حیرت انگیز حد تک سیدھی اور توازن کی حامل ہیں۔ ان کے درمیانی فاصلے کو کم یا زیادہ کر کے مختلف انداز کا تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ ایک برتن پر تمام ترلائنیں بالعموم ایک ہی ضابطے کے تحت بنائی گئی ہیں۔ بعض صورتوں میں ابھار اور بعض میں دبازت نمایاں کر کے الگ الگ انداز کے برتن بنائے گئے ہیں۔ اس طرز کی ایک اور خوبصورت مثال وہ ٹھیکریاں پیش کرتی ہیں جن میں یہ جھریاں افقاً بنانے کی بجائے لہریہ دار انداز میں تشکیل دی گئی ہیں۔ لہروں کے مد و جزر کم یا زیادہ کر کے ان کا تاثر جدا جدا کیا گیا ہے۔ اس قبیل کی ٹھیکریاں ٹیلے کے مطالعے کے دوران کم کم نظر آئیں۔ یہ خاص انداز برتن کو آرائش کے لحاظ سے ہاکڑہ کی شگافتہ یا incised پاٹری کے بالکل قریب پہنچا دیتا ہے۔ پیڑاں والی سے ملنے والی ٹھیکریوں پر گہرے سرخ رنگ کی تہہ دیکھنے میں آتی ہے۔ ہاکڑہ incised اور کوٹ ڈیجی کی ان زیر بحث ٹھیکریوں کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو یہ اخذ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ کوٹ ڈجی عہد کی یہ پاٹری قدیم تر طرز کی ہی ایک ارتقائی شکل ہے۔ Grooved پاٹری کی ایک خوبصورت مثال وہ ٹھیکری پیش کرتی ہے جس پر ایک پھول نما نقش بنایا گیا ہے، جس کی بنیاد چوکور اور تکون کی اقلیدسی اشکال پر رکھی گئی ہے۔

نمونے کے درمیان نسبتاً چھوٹی چوکور بنانے کے بعد اس کے ہر ضلع پر ایک مثلث بنائی گئی ہے۔ ان چار مثلثوں کے اضلاع باہم برابر جبکہ مربع کے اضلاع کی نسبت تقریباً دو گنے ہیں۔ نمونہ دیکھنے میں ایک پھول کی طرح لگتا ہے اور اس حوالے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ چوکور اور تکون کی اشکال باہم ملا کر ڈیزائن تشکیل دینا کوزہ گر کی ذہنی اپچ کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔

جھری دار پاٹری کی کچھ ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں جن میں برتن کے تقریباً درمیانی حصے میں دو سیاہ لکیریں بنا کر ان کے درمیان ایک سفید لکیر بنائی گئی ہے۔ یہ برتن جہاں سرخ، سیاہ اور سفید رنگوں کی نقش گری کے حوالے سے ملٹی کروم پاٹری کی مثال پیش کرتے ہیں وہیں سفید رنگ کی نسبت سے ’’سوتھی‘‘ کلچر کے ترجمان بھی ہیں جس کی مثالیں سرخ Slip کے حامل برتنوں پر سیاہ اور سفید نقش گری کے حوالہ سے سوتھی کے ساتھ ساتھ کالی بانگاں، سیسوال اور کوٹ ڈجی میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

تمام برتن خوب گندھی ہوئی مٹی سے بنا کر اچھی طرح پکائے گئے ہیں۔ ان کا رنگ قدرتی طور پر سرخ ہے جس پر خوبصورتی کے لئے اسی رنگ کی Slip مہیا کی گئی ہے۔ اس تہہ کی رنگت ہلکی سرخی مائل سے لے کر بھوری اور بعض صورتوں میں کلیجی تک ہو جاتی ہے۔ جھری دار برتنوں کے دہانے پر باہر کی طرف سیاہ پٹی، جو کوٹ ڈجی عہد کے برتنوں کی ایک نمائندہ خصوصیت ہے، نظر آتی ہے۔ اس پٹی کی چوڑائی مختلف صورتوں میں مختلف ہے بعض مثالوں میں دہانے کی چوڑی پٹی کے نیچے تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر ایک اور سیاہ لائن بنائی گئی ہے جس کی چوڑائی اول الذکر پٹی سے خاصی کم ہے۔ دونوں پٹیوں کا باہمی فاصلہ مختلف صورتوں میں مختلف ہے۔ دہانے کی اندرونی سمت بھی ایسی ہی لکیریں بنائی گئی ہیں البتہ ان لکیروں کا رنگ بالعموم سرخی مائل یا بھورا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں چوڑی پٹی کے اوپر ایک باریک سی سیاہ لکیر بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس انداز کے جو برتن ملے ان میں چھوٹے برتنوں سے لے کر درمیانی جسامت کے برتن شامل ہیں۔

Grooved پاٹری کے ساتھ ساتھ کوٹ ڈجی عہد کی ایک اور نمائندہ طرز ان سادہ مگر دیدہ زیب برتنوں کی ہے جن پر گاڑھے سرخ رنگ کی باریک تہہ ان کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ دہانے پر اندرونی اور بیرونی دونوں اطراف مختلف چوڑائی کی رنگین پٹیاں ہیں۔ بیرونی سمت بالعموم سیاہ جبکہ اندرونی جانب سرخی مائل رنگ کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس طرز کے ساتھ ساتھ بھورا، سلیٹی

مائل یا سیاہ رنگ بھی بعض برتنوں کی اندرونی سمت دیکھنے میں آتا ہے۔ بیرونی اور اندرونی پٹیوں کی چوڑائی کے حوالے سے بھی کوئی خاص اصول نظر نہیں آتا۔ غالباً کوزہ گر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق انہیں بناتا ہوگا۔ زیادہ صورتوں میں ایک جبکہ بعض مثالوں میں ایک سے زائد لائنیں بنائی گئی ہیں جن سے خوبصورتی میں اضافہ مقصود ہوگا۔ دہانے کی اندرونی اور بیرونی سمت بنائی گئی ان پٹیوں کی نسبت سے برتنوں کی اس طرز خاص کو Banded Pottery کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تزئین و آرائش کا مندرجہ بالا انداز عام طور پر ان برتنوں میں نظر آتا ہے جو پکانے یا کھانے پینے کی اشیاء کو محفوظ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس برتنے کے عام کوزوں اور پیالوں میں باریک لائنیں جن کی تعداد تین چار سے لے کر دس بارہ، ان کے مابین یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے برتن کے دہانے کی اندرونی سمت جبکہ بیرونی طرف بالعموم ایک چوڑی پٹی بنائی گئی ہے بعض صورتوں میں متوازی لائنوں کی بجائے ایک دوسرے کو قطع کرتی Loops کو آرائشی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کوزہ گر کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ کھلے برتنوں میں اندرونی سمت بنیادی اہمیت کی حامل ہونے کی وجہ سے زیادہ آرائش و زیبائش کی متقاضی ہے۔ اور اسی احساس کے تحت اس نے کھلے برتنوں کی اندرونی سمت پر زیادہ توجہ دی ہے۔

Flanged پاٹری کی بعض خوبصورت مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں جن کو سنوارنے اور خوبصورت بنانے کی خاصی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ٹھیکری پر سرخی مائل مٹیالے رنگ کی سلپ پر سیاہ رنگ کی تین تین باریک اور متوازی لائنیں تین دفعہ بنا کر ان کے درمیان نسبتاً لہریہ دار لکیریں کھینچ کر ایک ڈیزائن تشکیل دیا گیا ہے۔ دہانے اور Flange کی درمیانی جگہ گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ Flange میں ڈھکنے کی مدد سے برتن ڈھانپنے کے لئے سوراخ بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک اور مثال میں جو نسبتاً زیادہ خوبصورت ہے برتن پر زردی مائل تہہ بچھانے کے بعد سیاہ اور گہرے سلیٹی رنگوں سے آرائش کی گئی ہے۔ دہانے اور فلیج کے مابین کئے گئے گہرے سلیٹی رنگ میں کوئی ایسا عنصر بھی شامل کیا گیا ہے جس سے برتن میں ایک نمایاں چمک پیدا ہوگئی ہے جو دیکھنے میں بھلی لگتی ہے۔ Flange سے نیچے سیاہ رنگ کی چند متوازی افقی لائنیں برتن کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان لکیروں کے نیچے مربع شکل کے خانے ایک لائن کے ذریعے باہم جڑے ہوئے برتن کی خوبصورتی

میں اضافہ کرتے ہیں۔ مربع کا ہر ضلع تقریباً پون انچ کا ہے جبکہ چہار خانوں کا باہمی فاصلہ بھی تقریباً اتنا ہی ہے جسے ایک لکیر سے آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ ان مربعوں کے درمیان پینتالیس درجے کی متوازی لائنیں بنا کر ان کی دلکشی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں چہار خانے نہیں وہاں لائن کے آر پار الٹی اور سیدھی ''T'' کی صورت اس طرح بنائی گئی ہے کہ چہار خانوں اور ان کے مابین خوبصورت یگانگت اچھوتے نمونے کو جنم دے دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خاص نمونہ ابتدائی ہڑپائی عہد میں کسی حد تک رائج رہا۔ رحمان ڈھیری کے مطالعے کے دوران بالکل اسی طرز کے نقوش کے حامل برتنوں کے ٹکڑے دیکھنے میں آئے۔ ان گلی ٹکڑوں میں سے بعض Flanged Pottery کی باقیات میں سے تھے جبکہ بعض سادہ برتنوں سے تعلق رکھتے تھے۔

قدیم پاٹری کے اس مطالعے کے دوران ایک دو ٹھیکریاں ایسی ملیں جو انفرادی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک پر زردی مائل buff رنگ کی تہہ مہیا کرنے کے بعد سیاہ رنگ کا خوبصورت جیومیٹریکل ڈیزائن بنایا گیا ہے اور افقی وعمودی لائنوں اور مربع شکل کے ملاپ سے برتن کو قابل دید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک اور برتن پر ایسی مٹی کا لیپ یا Mudwash کیا گیا ہے جس میں ریت کی کثرت ہے۔ اسی وجہ سے ابرقی ذرات خوبصورت انداز میں دمکتے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ Mudwash کا استعمال بنیادی طور پر برتن میں رکھی شے مثلاً پانی کو زیادہ ٹھنڈا کرنے کے حوالے سے سودمند تصور ہوتا ہے۔ گیلی بوری یا کپڑے کا استعمال کر کے برتن کو ایک اضافی تہہ فراہم کرنے کا رواج بھی خال خال دیکھنے میں آتا ہے۔ آج بھی Mudwash کی مختلف صورتیں با آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ بعض تو اس درجہ ماقبل تاریخ کی مثالوں کے قریب پہنچتی ہیں کہ سرسری طور پر دیکھنے سے دونوں کے مابین تفریق کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہاکڑہ عہد کی ایپلک، کوٹ ڈجی اور ہڑپائی ادوار کی Mudwash پاٹری بھی اسی سوچ کے تحت بنائی جاتی ہوگی۔

عروج یافتہ ہڑپائی دور سے متعلق برتن زیادہ بڑی تعداد میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ غالب گمان ہے کہ اس عہد میں پیڑاں والی کے رہنے والے کسی خاص وجہ کے باعث جنوب میں کچھ فاصلے پر واقع بلند و بالا ٹیلے ''پنج پیر'' کی جانب منتقل ہو گئے ہوں گے۔ پنج پیر عروج یافتہ ہڑپائی

دور کی باقیات کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل اثری ٹیلہ ہے۔ جہاں تک پیڑاں والی کا تعلق ہے عروج یافتہ ہڑپائی عہد کی Pottery میں روزنی یا Perforated ظروف اور ڈش آن سٹینڈ کے ٹکڑے محدود تعداد میں اس ٹیلے پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ڈش آن اسٹینڈ کی کچھ صورتیں ابتدائی ہڑپائی عہد میں بھی ملتی ہیں لیکن Perforated Pottery خصوصیت کے ساتھ عروج یافتہ ہڑپائی دور اور مابعد سے منسوب ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مابین یہ برتن دلچسپ مباحث اور نتیجے کے طور پر متضاد آراء کا باعث بنے ہیں۔ لیکن ابھی تک حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرز خاص کے حامل برتن کسی ایک مقصد کے تحت بنائے جاتے تھے یا پھر ایک سے زائد مقاصد کون کون سے تھے جن کے حوالے سے عروج یافتہ ہڑپائی دور کے ساتھ ساتھ یہ مخصوص برتن متاخر ہڑپائی دور میں بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ البتہ متاخر عہد میں بنائے گئے اکثر برتنوں میں وہ مہارت اور چابکدستی مفقود ہے جو عروج یافتہ ہڑپائی دور میں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ ثبوت بھی ملتے ہیں کہ Perforated ظروف بنانے کی روایت متاخر ہڑپائی دور کے بعد بھی کلیتاً متروک نہیں ہوئی۔ محدود پیمانے پر سن عیسوی کے آغاز سے متصل پہلے اور بعد کے زمانے سے تعلق رکھنے والے اثری ٹیلوں پر بھی اس طرز کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ٹیکسلا کے آثار کے علاوہ ضلع راولپنڈی میں مندرہ کے نواح میں کالا، قدیم بھیرہ اور سیالکوٹ کے نواح میں جہاں بدھ عہد کے آثار کی کثرت ہے Perforated پاٹری کے کئی نمونے دیکھنے میں آئے۔ شورکوٹ کے قدیم آثار سے بھی اس کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مثالیں عروج یافتہ یا متاخرہ ہڑپائی دور کے مختلف سائز اور عموماً ٹھوس اور مضبوط برتنوں کے برعکس نازک برتنوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ریت اور رواج کا یہ تسلسل، اپنے چھوٹے چھوٹے تضادات سمیت، تحقیق طلب ہے۔ دیگر حوالوں کے علاوہ ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ کیا معاشرے میں قدیم تر کوزہ گروں کی نسل سے تعلق رکھنے والے کچھ دستکار ہنوز موجود تھے یا محض ایک انوکھی روایت نے بعد میں آنے والے ہنرمندوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔

برتنوں کے علاوہ ملنے والی اشیاء میں سرمئی اور سرخ رنگ کی مٹی کی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے سیکشن گول بھی ہیں اور ایسے بھی جن کی بیرونی اطراف انگلیوں سے دبا کر تکون کی شکل بنا دی گئی ہے۔ تکونی شکل صرف سرخ رنگت کی حامل چوڑیوں میں

نظر آتی ہے۔ ایک آدھ مثال ایسی بھی ملی جس میں دو سرمئی چوڑیوں کو باہم ملا کر پکایا گیا ہے۔ چوڑیوں کے ٹکڑے اور ان کی قوسیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ بچوں اور جوانوں دونوں کے لئے بنائی جاتی تھیں۔

مٹی کے بنے ہوئے منکے بھی دستیاب ہوئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مٹی کے Cones باہم ملا کر پکائے گئے ہوں۔ اس شکل کا ایک چھوٹا سا منکہ سوا سینٹی میٹر کے قریب لمبا ہے جبکہ اس کا قطر اس سے تھوڑا سا زیادہ ہے۔ بڑے منکے تقریباً تین سوا تین سینٹی میٹر لمبے اور اس سے کچھ زائد چوڑے ہیں۔

نیم قیمتی پتھروں میں لاجورد اور عقیق کے منکے دیکھنے میں آئے۔ یہ بظاہر چھوٹے چھوٹے Beads دیکھنے والے کو عالم تصور میں بدخشاں، دکن اور بلوچستان کی Queries تک لے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ان تجارتی راستوں پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک وسیع میدان بھی فراہم کرتے ہیں جو ہڑپائی عہد تک آتے آتے وادی سندھ اور دیگر تہذیبی و ثقافتی مراکز کے درمیان قائم ہو چکے تھے۔ ان راستوں پر گامزن باقاعدہ اور بے قاعدہ کاروباری طبقے بھی ہماری دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔ اسی نوع کی ایک اور اہم شے سیپ سے بنی ہوئی وہ چوڑیاں ہیں جو ساحل سمندر پر واقع مختلف تجارتی مراکز سے وادی سندھ کے طول و عرض میں پھیلی سینکڑوں چھوٹی بڑی بستیوں تک آتی تھیں۔ اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ چوڑیاں بنی بنائی صورت میں درآمد ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر بھی بنائی جاتی تھیں جس کی نشاندہی سیپ کے شکستہ ٹکڑے اب تک کرتے نظر آتے ہیں۔ ''پیڑاں والی'' سے بھی سیپ کی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے ہاتھ آئے۔

چرٹ پتھر کے کچھ بلیڈ بھی ٹیلے کی سطح سے ملے۔ کریم رنگ کے یہ بلیڈ بظاہر روہڑی یا اس کے نواح سے دستیاب ہونے والے پتھروں سے بنائے گئے ہیں ان کی چمک دار دھار اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ چرٹ کے بلیڈ اوزاروں کے ساتھ ساتھ ملنے والی ایک اور دلچسپ چیز سیاہ چرٹ کی وہ Core ہے جو اپنی نوعیت کے حوالے سے قدیم تر اور مختلف Querry سے متعلق محسوس ہوتی ہے۔ غالباً بلوچستان، کوہ سلیمان یا کوہستان نمک کے کسی مرکز سے

زمانہ ماقبل تاریخ سے متعلق مختلف اثری ٹیلوں کی کھدائی کے نتیجے میں سامنے آنے والے

شواہدات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چرٹ کے اوزار وسطی ہجری دور کے اختتام پر بننے شروع ہو گئے تھے۔ بعض قدیم آبادیوں کی کھدائی کے دوران ان اوزاروں کے ساتھ رہت سہت کی دوسری علامات مثلاً کوزہ جات دستیاب نہیں ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ابھی تک سیر و شکار پر انحصار اور عارضی نوعیت کے رہائشی ٹھکانوں پر اکتفا کرتے ہوں گے۔ بعد کے ادوار میں البتہ گلی ظروف، آرائش و زیبائش کی اشیاء اور ابتدائی طرز تعمیر کے نمونوں کے ساتھ ساتھ چرٹ اوزاروں کی موجودگی برقرار رہی اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلا جب تک انسان ان اوزاروں کی طرز پر دھات کے اوزار بنانے کے قابل نہیں ہو گیا۔ ان بظاہر بے بضاعت سنگی ٹکڑوں کا مطالعہ عمیق نظری سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابتداً ان ٹکڑوں کو بالعموم اکائی کی حیثیت میں کام لایا جاتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے شعور حاصل کر لیا کہ چرٹ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مرکب اوزار ترتیب دینے میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں اور انہیں ہڈی، بانس یا لکڑی کے دستے میں لگا کر زیادہ احسن طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خم دار لکڑی یا ہڈی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر کے بلیڈز کو ان میں پیوست کرنے اور مضبوطی سے باندھنے کے بعد درانتی کا کام لیا جانا بھی ممکن ہے۔

پیڑاں والی سے ملنے والے چرٹ اوزار بھی مفرد یا مرکب صورتوں میں استعمال ہوتے رہے۔ ان کے دندانوں کے خم اور چمک ان کے تادیر استعمال کی دلیل فراہم کرتے ہیں۔

پتھر کے اوزاروں میں سل پر پیسنے کے لئے استعمال ہونے والا ایک پتھر مکمل درست حالت میں دستیاب ہوا جس کے مختلف پہلو اس کے استعمال پر دلالت کرتے ہیں۔ مٹی کا ایک پختہ بٹہ بھی جو شکل میں بہت حد تک T/c کیکس سے ملتا جلتا ہے دیکھنے میں آیا۔ خیال ہے کہ مٹی کے برتنوں میں غلے سے چھلکا اتارنے کے لئے اس طرز کے پختہ کیک استعمال ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ پتھر کا بٹہ استعمال کرنے کی صورت میں برتن کے ٹوٹنے کا احتمال ہوتا ہو گا۔

ٹیلے کی جنوب غربی سمت میں صنعتی سرگرمی کی واضح علامات ملتی ہیں۔ بھٹی کی میل کچیل پر مشتمل پختہ ٹکڑے، فرنس کی باقیات اور اس نوعیت کی دیگر اشیاء، سرسری نظر ڈالنے پر بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ برتن، چوڑیاں، گھگو گھوڑے، نیم قیمتی پتھروں کے منکے سب ہی کی تیاری میں بھٹیوں کی ضرورت پڑتی ہو گی۔ تانبے کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑے اور خال خال تانبے کی مختلف اشیاء

کے ٹوٹے ہوئے حصے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ تانبہ پگھلا کر اوزاروں یا استعمال کی دیگر اشیاء کی صورت میں ڈھالا جاتا ہوگا۔ پیڑاں والی سے بجانب شاہ کوٹ مارٹن پور کے ساتھ واقع ہڑپائی بستی میں بھی بہت سی بھٹیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان ٹیلوں کا تفصیلی جائزہ اور اگر ممکن ہو تو کسی قدر باقاعدہ کھدائی اس امر کا تعین کرنے کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ تانبے کے اوزار محدود پیمانے پر مقامی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہی بنائے جاتے تھے یا انہیں دوسری ہم عصر آبادیوں میں فروخت کرنے یا بارٹر سسٹم کے تحت اشیاء کے لین دینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

بچوں کے لئے بنائے جانے والی اشیاء میں کھلونا برتن اور گھگو گھوڑے خصوصی دلچسپی کے حامل تھے۔ کھلونا جانوروں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس ماحول میں موجود جانوروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک آدھ مثال میں کوہان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیل بنایا گیا ہے۔ ایک دو کھلونے کتے سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک کسی قدر مکمل مثال میں جانور کی پچھلی ٹانگیں جدا جدا جبکہ اگلی باہم پیوست ہیں۔ سادہ مٹی کے پکائے ہوئے ان کھلونوں پر کسی قسم کی آرائش یا Slip وغیرہ موجود نہیں ہے۔

مٹی کے برتنوں کے بعض ایسے ٹکڑے بھی جنہیں دانستہ توڑ کر گول بنانے کی کوشش کی گئی ہے دستیاب ہوئے۔ پنجاب کے شہر اور دیہات دونوں میں بچے ''پٹھو گرم'' نامی کھیل نہایت شوق سے کھیلتے ہیں اسی طرح ''سٹاپو'' نامی کھیل میں آج بھی اس انداز کے ٹکڑے استعمال ہوتے ہیں۔ اول الذکر کھیل میں اگرچہ ایک گیند درکار ہوتی ہے لیکن موخر الذکر میں تو محض ٹھیکری ہی کام دے دیتی ہے۔

چولہے کا ایک ٹوٹا ہوا حصہ، جس پر مخروطی شکل کا ایک ابھار ابھی تک محفوظ ہے، پنجاب کے دیہات میں دودھ یا کھانا وغیرہ گرم رکھنے کے لئے اس انداز کا چولہا استعمال کرنے کی روایت کی قدامت کا عکاس ہے۔ اس کے مسطح حصے کو زمین کے ساتھ بچھانے کے بعد اوپر دہکتے کوئلے رکھ دیئے جاتے ہیں اور تین یا چار ابھاروں پر برتن رکھ کر اس امر کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ کھانا دیر تک گرم رہ سکے۔ دیہی معاشرے میں خوراک سے متعلق ابتدائی سہولتوں کی فراہمی کی روایت کتنی قدیم ہے پیڑاں والی سے ملنے والے چولہے کا یہ حصہ اس کی کسی قدر نشاندہی کرتا ہے۔

چولہے کا ایک اور ٹکڑا جس کا جلا ہوا حصہ اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ استعمال میں آتا

رہا، ایک اور حوالے سے دلچسپی اور غور وفکر کا متقاضی ہے۔ مٹی گوندھنے کے بعد اس میں بھوسہ ملانے کی روایت آج بھی زندہ ہے۔ ماقبل تاریخ کے اس چولہے کے ٹکڑے کو دیکھ کر اس روایت کی قدامت کا اندازہ لگانے کے ساتھ ساتھ اس طرح کی باقیات سے اس بات کا تعین بھی ہوسکتا ہے کہ ماحول میں کون کون سا غلہ پیدا ہوتا ہوگا۔ جو سے ملتے جلتے دانے اور بھس بڑی آسانی سے شناخت میں آجاتے ہیں۔ ایسی باقیات کا محتاط مطالعہ عہد قدیم میں اس ماحول میں پائی جانے والی بعض فصلوں کے بارے میں ہمارے علم میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

ٹیلے کی سطح سے ملنے والی ایک اور دلچسپ شے مٹی کی پختہ ٹکیوں یا T/c کیکس کے ٹوٹے پھوٹے حصے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں تو دیکھنے میں نہیں آتے لیکن اکا دکا مثالیں بہرحال مل جاتی ہیں۔ T/c Cakes کے حوالے سے ماہرین آثار قدیمہ کی ٹائلٹ پیپر سے لے کر برتن پکانے کی بھٹیوں کے دہانے پر حرارت اور دھوئیں کو کنٹرول میں رکھنے والی گلی ٹکیوں تک کی آراء ہمارے سامنے آتی ہیں۔ بہرحال یہ خیال کرنا کہ یہ کسی ایک خاص مقصد کے لئے استعمال ہوتی ہوں گی درست نہ ہوگا۔ ان کی مختلف ساخت بھی اسی رائے کو تقویت دیتی ہے۔ ایسی ٹکیاں جن کے درمیانی حصے میں دونوں اطراف پر ایسی دبازت یا پچکاؤ نظر آتا ہے جو انگوٹھے اور انگشت شہادت سے ناپختہ مٹی کی کسی شے کو پکڑنے پر وجود میں آسکتا ہے اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ دبازت ان ٹکیوں کو پکانے سے قبل موجود ہوگی اور پختہ ہونے پر ان Cakes کو مضبوطی سے گرفت میں لانے کے بعد استعمال کرنا مقصود ہوگا۔ یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ گول، تکونی یا مستطیل نما سفالی ٹکیاں اپنی مخصوص ساخت کے حوالے سے مختلف انداز میں استعمال ہوتی ہوں گی اور جس مقصد کے لئے جو شکل مناسب سمجھی جاتی ہوگی وہی اختیار کی جاتی ہوگی۔

Terracotta Cakes کے حوالے سے یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ تکون، مدور، آلو یا کچالو نما ٹکیاں اس قدر کثیر تعداد میں عروج یافتہ ہڑپائی دور ہی میں کیوں نظر آتی ہیں۔ یاد رہے کہ کوٹ ڈجی دور کے وسط سے ہمیں کم کم تعداد میں ان کا وجود نظر آنا شروع ہو جاتا ہے لیکن عروج یافتہ ہڑپائی دور کے بعض اثری ٹیلوں کو دیکھ کر تو یہ گمان گزرتا ہے کہ ان آبادیوں میں شاید یہ Cakes بنانے کے علاوہ کوئی اور بنیادی کام کیا ہی نہیں گیا۔ ملتان کے نواح میں قطب پور کے

نزدیک چک 160 W.B کے بڑے حصے پر دوہاڑی کے قریب کسم سر اور چیچہ وطنی تحصیل میں چک 90/12-L میں کم و بیش یہی صورت حال نظر آئی۔ عروج یافتہ ہڑپائی عہد سے متعلق اور بہت سے اثری ٹیلوں پر بھی یہی معاملہ دیکھنے میں آیا۔ یہ صورت احوال اس رائے کو تقویت دیتی ہے کہ عروج یافتہ ہڑپائی عہد میں کوئی نہ کوئی سرگرمی ایسی ضرور تھی جس کے لئے وافر تعداد میں ان کیکس کی ضرورت پڑتی تھی۔ مٹی کے برتن بنانے کے حوالے سے دھوئیں یا درجہ حرارت کو مخصوص حد میں رکھنے کے لئے ان کا استعمال زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ان ٹکیوں کی شکل اس خاص حوالے سے باہم اختلاف کی حامل ہے۔

ہڑپہ میں ہونے والی نئی کھدائیوں میں جہاں اور بہت سے دلچسپ انکشافات ہوئے وہیں گلیوں، سڑکوں کے علاوہ بعض تعمیرات میں دیواروں کے نیچے ان آلو نما ٹکیوں کی تہہ کا سراغ بھی ملا ہے۔ غالباً یہ T/c کیکس راستوں کی پختگی بڑھانے اور ہر موسم میں آمدورفت ممکن بنانے کے لئے ناگزیر ہو گئے تھے۔ بڑے قصبے یا شہر جہاں باقاعدہ منصوبے کے تحت سڑکیں، گلیاں اور مکانات بنائے جاتے ہوں گے وہاں ان کا استعمال بڑی تعداد میں ہوتا ہوگا۔ یہ صورت حال بالکل ایسی ہے جیسی آج کل شہروں کے نواح میں اینٹوں کے بھٹوں کی صورت دیکھنے میں آتی ہے۔ جس طرح نواحی علاقوں میں واقع ان بھٹوں سے اینٹیں شہروں میں ہونے والی تعمیرات کے لئے لائی جاتی ہیں بعینہ اسی طرح عروج یافتہ ہڑپائی دور کے بڑے شہروں کے قرب و جوار میں واقع بعض آبادیاں T/c کیکس بنا کر شہروں کو سپلائی کرنے کے مراکز کی حیثیت رکھتی ہوں گی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اولین استعمال میں آنے والی شے جو وادی سندھ میں راستے مضبوط اور پختہ کرنے کے لئے استعمال ہوئی یہی Nodules تھے۔

اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ پیڑاں والی بعض حوالوں سے انتہائی اہم ٹیلہ ہے۔ یہ کوٹ ڈیجی یا ابتدائی ہڑپائی عہد کے آثار کی عکاسی خاصے بھرپور انداز میں کرتا ہے۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ اس کی حفاظت کا جس حد تک ہو سکے اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی انداز میں اس کے مطالعے کی کوشش کی جائے۔ قبرستان بننے کی وجہ سے یہاں موجود کچھ اشیاء شاید

مطالعے کے لئے محفوظ رہیں لیکن اپنی اصل جگہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے ان سے وہ نتائج یقیناً اخذ نہیں کیے جاسکیں گے جو اصولی طور پر استنباط کرنے کے لئے ضروری ہیں۔

* * *

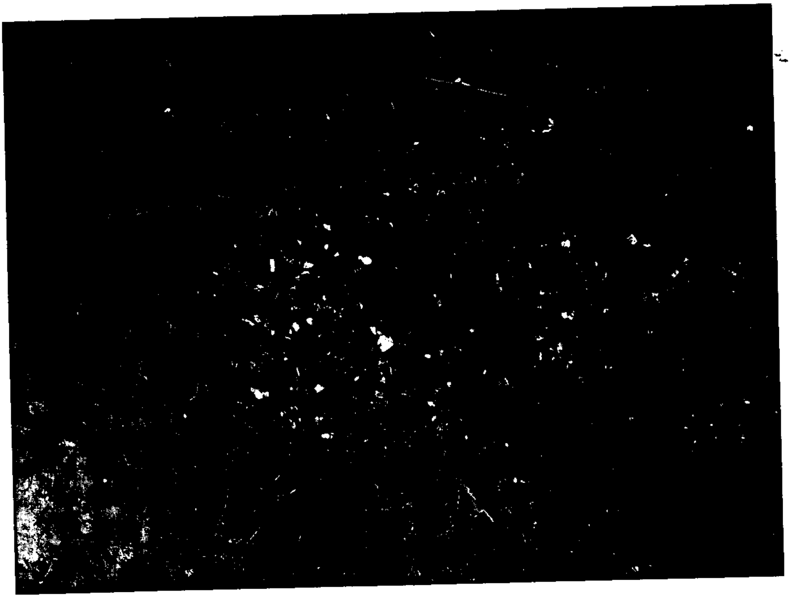

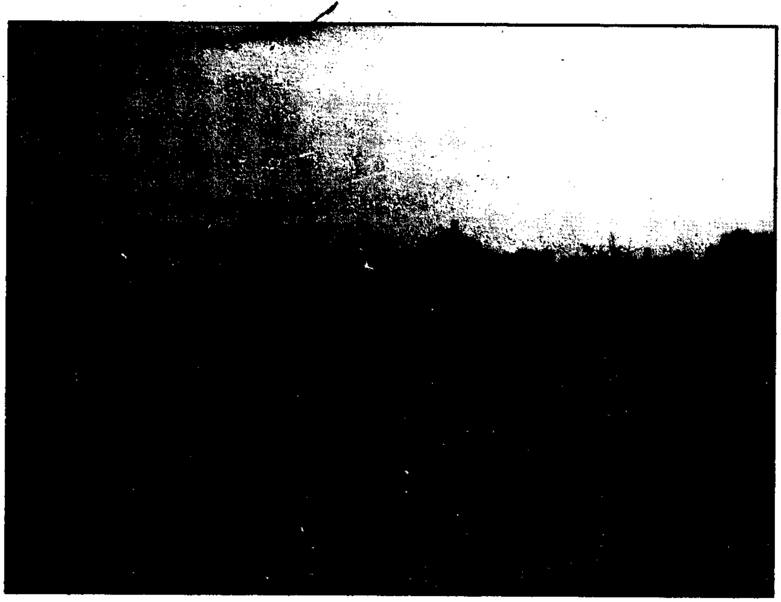

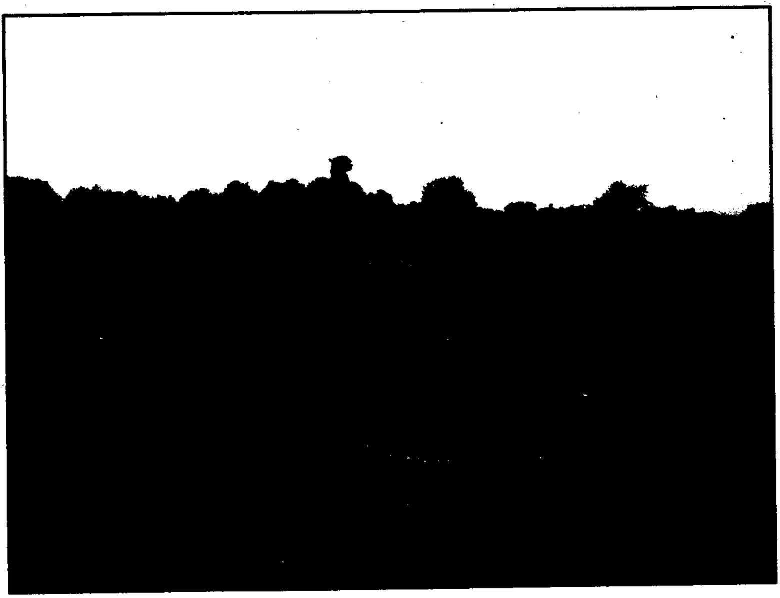

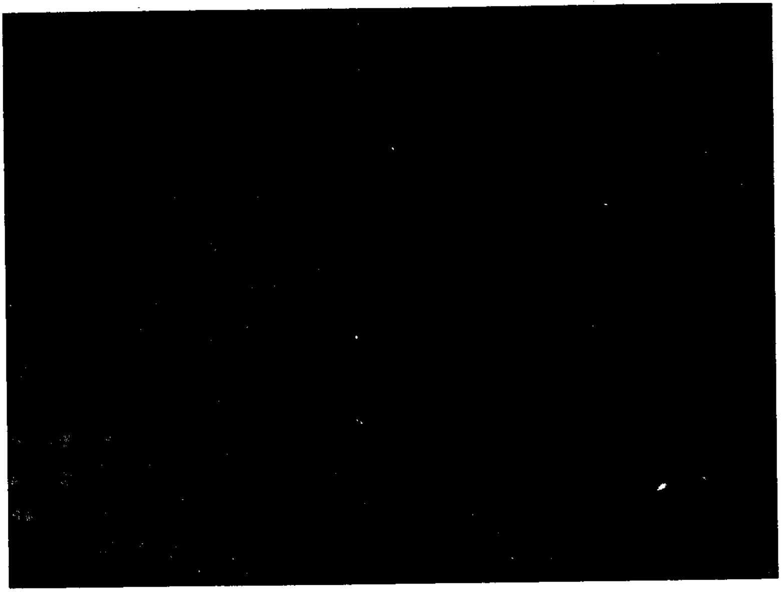

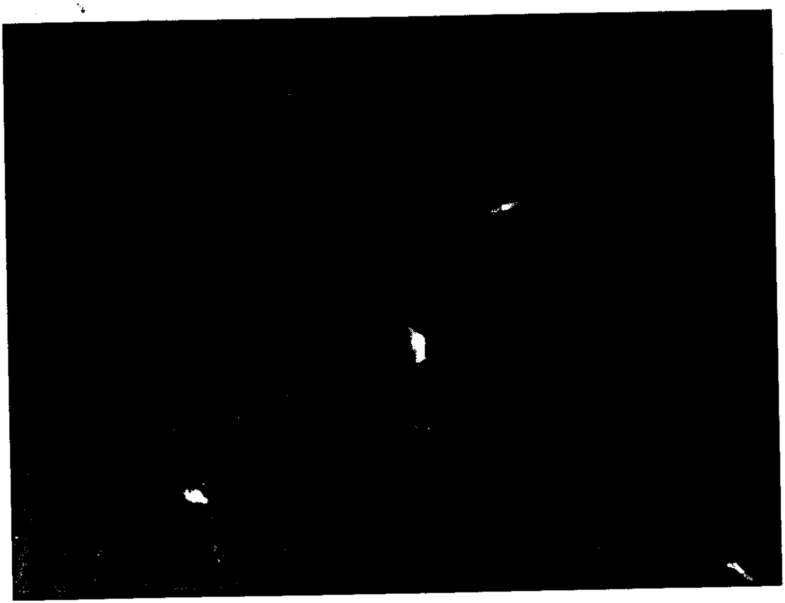

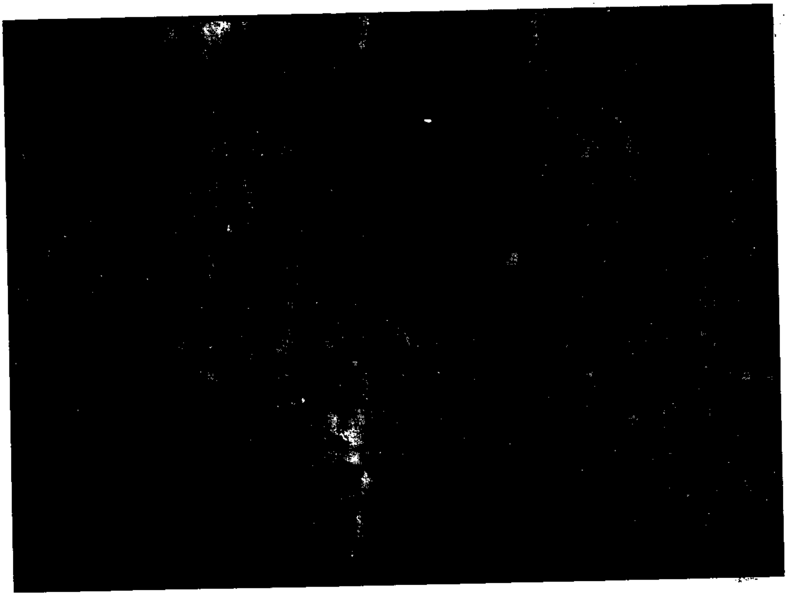

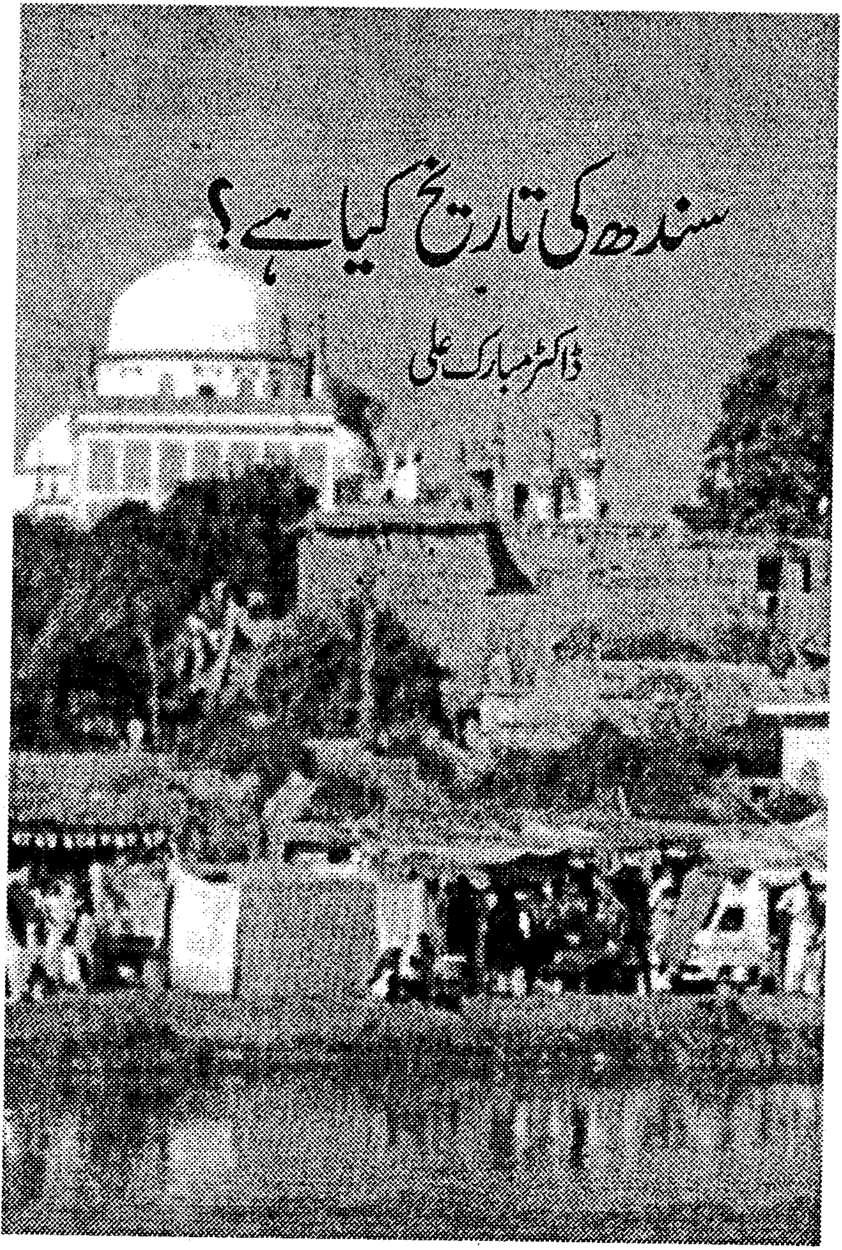

سندھ کی تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

قیمت: 90/-

[illegible]

یارخان ومرتضیٰ خان ومحمد یارخان کی پرورش انہوں نے ہی کی۔ تقسیم ملک کے وقت ان کو

تھی۔ سعید معصوم بریلی میں قلعہ نومحلہ میں رہتے تھے۔ اب یہ قلعہ ختم ہو چکا ہے۔ البتہ اس کی عظیم الشان مسجد موجود ہے جس میں سید معصوم شاہ اور ان کے والد کے مزارات ہیں۔ (حیات حافظ رحمت خان ص 280)۔ سید احمد شاہ انہی سید معصوم کے والد تھے۔

272- نو ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 12 مئی 1745ء بروز بدھ۔

273- جب آدمی کے لئے دنیا سیاہ ہو جائے۔
تو جو کچھ بھی (تدبیر) وہ کرے اس کے کام نہیں آ سکتی۔

274- رات کو ہم نے اس وقت ہاتھ سے یار کی زلف چھوڑ دی
جب امر کی انجام دہی میں طوالت دیکھی
ہم نے شراب نہیں پی اور بہار کا موسم گزر گیا
ہمارے ہاتھ سے بہار مفت میں ہی نکل گئی
تقدیر کے آگے عقل کی کچھ نہیں چلتی
خدا کی قسم! ہم نے اپنا اختیار ہی چھوڑ دیا
ہم زندگی سے اب اور کیا چاہیں
دلگی تھی اور یار چھوٹ گیا
صحرا کے کنارے فصل بہار دیکھ کر
ہم نے سیر و شکار کو داد دنیا چھوڑ دیا
دل سے عشق کا شُعلہء بلند ہوا
ہم نے اس کے حصار کی ایک آگ چھوڑ دی
لیکن اس گرد خاک میں کیا فائدہ
کہ اس خاکسار مخلص کو چھوڑ دیا

275- دس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 13 مئی 1745ء بروز اتوار۔

276- اصل نسخے میں لفظ ''مسلمان'' ہے۔ ڈاکٹر اظہر نے متن میں ''مسلمانان'' درج کیا ہے اور ساتھ ہی اصل لفظ کی وضاحت کر دی ہے۔

277- بن گڑھ ایک قدیم قصبہ تھا جس کے اب بھی آثار باقی ہیں۔ یہ یوسف نگر گاؤں کے

قریب ہے۔ یہاں پر علی محمد خان نے اپنی حفاظت کی غرض سے قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ بلکہ آنند رام کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہاں پر چار قلعے تھے جو بعدازاں جنگ کے دوران اور کچھ جنگ کے بعد بادشاہ کے حکم سے مسمار کر دیئے گئے۔ اس کے اردگرد گھنا جنگل تھا جو کہ حفاظت کا کام دیتا تھا۔ یہ بدایوں سے آنولے جانے والی سڑک کے پاس آباد ہے۔ (مرادآباد گزیٹیر ص 146-47 ڈاکٹر اظہر ص 57 حاشیہ 1)۔

-278 عبدالمجید خان کو بارہ مئی 1739ء کو دیوان خالصہء شریفہ مقرر کیا گیا۔ پھر 15 فروری 1744ء کو اسے دیوان تن بھی مقرر کیا گیا۔ 1751-2ء بمطابق 1165ھ میں فوت ہوئے (سیر المتاخرین جلد دوم ص 3) (مآثر الامراء جلد سوم ص 707-708) اس کے لڑکے کا نام عبدالاحد خان تھا۔ اس کا ایک بھائی ابوالبرکات نامی بھی تھا۔

-279 ''پوری'' روٹی کی طرح سے کھانے کی ہوتی ہے۔ ہندوؤں میں اس کے کھانے کا کثرت سے رواج تھا اور آج تک ہے۔ یہ ''حلوہ پوری'' کی پوری کی طرز کی ہوتی ہے مگر سائز میں دو یا تین نوالوں کے برابر ہوتی ہے اور گول ہوتی ہے۔

-280 بعد میں مخلص نے اس نند و کو نکال دیا تھا۔

-281 یعنی ارادہ ملتوی کر دینے والے اور بہانہ تراشنے والے۔

-282 بارہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 15 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

تیرہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 16 مئی 1745ء بروز اتوار۔

-283 حکیم محمد یوسف عبدالشافی خان، صاحب علم و فضل تھے۔ طب اور نجوم میں بھی ماہر تھے۔ مخلص کے بہت گہرے دوست تھے۔ دربار میں بھی اثر و رسوخ رکھتے تھے (ڈاکٹر اظہر ص 58 حاشیہ 1)۔

-284 سترہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 20 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

-285 صفراوی یعنی پت کا بخار۔

-286 چودہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 17 مئی 1745ء بروز پیر۔

-287 پندرہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 18 مئی 1745ء بروز منگل۔

-288 سولہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 19 مئی 1745ء بروز بدھ۔

289- سترہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 20 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

290- پال کہتے ہیں "آم کو پکا کرنا" یعنی آم کو پکانا جو مٹی میں رکھ کر کیا جاتا ہے۔

291- اٹھارہ ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 21 مئی 1745ء بروز جمعہ۔

291A- بھیر کا لفظی مطلب ہجوم ہے مگر یہاں پر مراد سرکاری محکمہ جات اور اس کے ملازمین سے ہے۔

292- یعنی لشکر کا اگلا حصہ۔

293- دوندے خان ابن حسن خان ابن محمود خان ابن شہاب الدین قوم بڑیچ پٹھان۔ دوندے خان حافظ رحمت کا چچا زاد بھائی تھا۔ 1117ھ/1705ء میں پیدا ہوا اور 3 محرم 1184ء میں 67 سال کی عمر میں قصبہ بسولی میں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ محب اللہ خان و فتح اللہ خان و عظیم اللہ خان تین لڑکے چھوڑے جو صاحب اولاد ہوئے۔ دوندے خان ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اور حافظ رحمت خان کا زور بازو تھا۔ روہیلہ تاریخ میں اس نے زبردست کردار ادا کیا جیسا کہ آنند رام کے سفرنامے سے بھی ظاہر ہے۔ چونکہ اس کی اولاد نے تاریخ نویسی پر کوئی توجہ نہیں دی اور حافظ رحمت خان کی اولاد نے تاریخ نویسی پر توجہ دی۔ لہٰذا تاریخ میں دوندے خان کا کردار نظروں سے اوجھل ہو گیا جبکہ حافظ رحمت کا نمایاں ہو گیا۔ اگرچہ دوندے خان کا کردار حافظ رحمت خان سے زیادہ نہیں تھا مگر اس سے کم بھی نہیں تھا۔ تاریخ میں اس کے کردار پر بہت کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔ دوندے خان مراد آباد کا گورنر (عہد روہیلہ میں) بھی رہا تھا۔ اس کی اولاد مراد آباد میں آج بھی آباد ہے۔

294- موضع لبی دراصل موضع بسولی ہے۔ یہ ضلع بدایوں میں شامل ہے۔ روہیلوں کا مضبوط مرکز رہا ہے۔ دوندے خان کی جاگیر تھی اور وہیں پر دوندے خان دفن ہے۔

295- اس سے ظاہر ہے کہ فوج نے لوٹ مار بھی راستے میں کی تھی۔

296- "اکاسی دیہ" میں آکاش (آسمان) سے اکاس بنا اور دیہ سے مراد دیا (چراغ) ہے یوں "اکاسی دیہ" سے مراد "آسمانی چراغ" ہے۔ یہ بانس شاید بہت زیادہ طویل ہو گا۔ آئین اکبری کے مطابق چالیس گز سے بھی طویل ہوتا ہے اور سولہ رسیوں سے باندھ کر

کھڑا کیا جاتا ہے (ڈاکٹر اظہر ص 61 حاشیہ 3)۔

297- انیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 22 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

298- بیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 23 مئی 1745ء بروز اتوار۔

299- بائیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 25 مئی 1745ء بروز منگل۔

300- تیئیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 26 مئی 1745ء بروز بدھ۔

301- سید شہادت خان بارھہ کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اظہر کا خیال ہے کہ اس کے نام کے ساتھ مخلص نے جو ”عوالی منزلت“ کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کوئی خاص آدمی ہوں گے۔

302- منشات مخلص میں اس محلے کا نام وکیل پورہ لکھا تھا۔

303- راکٹ یا آتش فشاں بان ہندوستان کی ایجاد ہیں جہانگیر اور شاہجہان کے دور میں بھی بڑے ”بان“ استعمال ہوتے تھے۔ اغلب امکان ہے کہ موجودہ شکل میں ”بانہائی آتشین“ افغانوں کی ایجاد ہیں۔ افغانوں نے یہ مرہٹوں کے خلاف بھی 1761ء میں استعمال کئے تھے۔ جدید راکٹ کا سب سے پہلا تذکرہ روہیلوں کی جنگ بن گڑھ میں ملتا ہے۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف استعمال کر کے انہیں سخت نقصان پہنچایا۔ جس کے بعد انگریز وہی راکٹ یورپ لے گئے اور ان میں اصلاحات کر کے بنانا شروع کر دیا۔ یہی راکٹ آگے چل کر میزائل کی بنیاد بنے۔

(ڈاکٹر اظہر: مقدمہ: ص 106 و 107; انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون ”راکٹ“)

304- چوبیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 27 مئی 1745ء بروز جمعرات۔

305- رہکلہ چھوٹی توپ کو کہتے ہیں۔

306- ”بانہائے آتش فشاں“ کے علاوہ مخلص نے اس جگہ پر دوسرا لفظ ”بانہائی جنگی“ استعمال کیا ہے۔

307- اروِن، اول، نے صفحہ 197 پر درج کیا ہے کہ ”مرزا مقیم عبدالمنصور صفدر جنگ ہراول پر حاکم تھا۔ ایک رات پٹھانوں نے شب خون مارا اور صفدر جنگ کے مورچے پر آن پڑے اور بہتوں کو تہ تیغ کیا۔“ اس جملے میں عبدالمنصور کی جگہ ابوالمنصور ہونا چاہئے۔

308- مدن بان: مدن ایک پھول کا نام ہے۔ اس سے مراد ہے وہ تیر (مدن بان) ہے جو عشق کا دیوتا چھ، سات پھولوں سے ملا کر بناتا ہے اور معشوق پر چلا کر اسے عشق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (ڈاکٹر اظہر ص 65 حاشیہ 1)۔

309- یعنی چراغ بجھانے کے بعد اس کی لَو اٹھ رہی تھی۔

310- طلایہ اس فوج یا دستہ کو کہتے ہیں جو رات کو لشکر میں پہریداری کرتی ہیں۔

311- پچیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 28 مئی 1745ء بروز جمعہ۔

312- قندھار جنوبی افغانستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ احمد شاہ ابدالی کا دارالحکومت تھا۔ یہاں پر پٹھان کثرت سے ہیں۔ مغلوں نے کئی بار اس پر قبضے کی کوشش کی۔ کبھی کامیاب ہوئے اور کبھی ناکام۔ شاہجہان کے دور میں مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ یہ شہر ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے درمیان ہمیشہ باعث نزاع رہا۔ اس کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور بہت ہی مشکل سے سر ہوتا تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قندھار کے پاس دور دور تک کوئی شہر وغیرہ نہ تھا جس سے حملہ آور کو خوراک و رسد کی قلت رہتی تھی اور اسے محاصرہ اٹھانا پڑتا تھا۔ بن گڑھ میں بھی چونکہ پٹھان تھے لہٰذا اسے قندھار سے تشبیہ دی گئی کیونکہ وہ بھی بہت مضبوط پناہ گاہ تھی۔

313- عمادالسعادت میں ہے کہ یہ جنگل کسی فولادی قلعے سے کم نہیں تھا اور توپ کا گولہ بھی اس میں کام نہیں آتا تھا۔

314- چھبیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 29 مئی 1745ء بروز ہفتہ۔

315- ملکہء زمانی فرخ سیر کی بیٹی اور محمد شاہ بادشاہ کی پہلی بیوی تھی۔ 9 دسمبر 1721ء کو اس کی بادشاہ سے شادی ہوئی تھی۔ اس کی خالہ زاد بہن صفیہ کی بیٹی صاحبہ محل بھی محمد شاہ کی بیوی تھی۔ ان کے بھی افغانوں سے تعلقات تھے۔ یہ دونوں بیگمات ہندوستانی حالات سے بددل ہو کر احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ چلی گئیں تھیں مگر بعدازاں واپس آ گئیں۔ ان کا سیاست میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ (سیدالمتاخرین جلد دوم ص 55، نادرات شاہی، مطبوعات رام پور، دیباچہ ص 6)۔

316- نائب صوبیدار نول رائے، قوم سکسینہ کائستھ، حکود خاندان سے تھے۔ اٹاوہ کے موروثی

قانون گو تھے۔ پہلے نواب برہان الملک صوبہ دار اودھ کے منشی رہے۔ صفدر جنگ نے قابلیت کی وجہ سے مہاراجہ کا خطاب دیا۔ اودھ کا سارا نظم ونسق سنبھالتے تھے۔ قیام و مکان قنوج میں تھا۔ بہت مالدار تھے۔ (سیر المتاخرین جلد دوم ص 11 و 29، عماد السعادت ص 43، آرون جلد دوم) نول رائے احمد خان بنگش کی مہم میں 13-اگست 1755ء کو مارے گئے۔ (مآثر الامراء جلد سوم ص 3-772)۔

اس کے قتل پر ایک بھاٹ مسمی بھولے نے احمد خان بنگش کو ایک گیت سنایا تھا جو درج ذیل ہے:

عجب وہ صاحب قدرت ہے جس نے جگ سنوارا ہے
خدائے پاک مولا ہے وہی پروردگارا ہے
کھڑا باندھا کمر کس کر غنیم اوپر لئے لشکر
لگے اس کے عجب چکر غروری کا خمارا ہے
نول سے مرد غازی کو، نہ پوچھے بات پاجی کو
نول سے مرد غازی کو، پہنچ گولی سے مارا ہے
نول ہودے سے مکھ موڑا، کہیں ہاتھی کہیں گھوڑا
قبائل بھی کہیں چھوڑا، نہ سر چیرہ سنبھارا ہے
چلیں توپیں دھڑا دھڑ سے، رھکلے بھی بڑا بڑ سے
شتر نالیں پڑا پڑ سے، تہور کا پہاڑا ہے
چلیں تیریں سناسن سے، چلیں گولی منا من سے
کٹیں بکر جھنا جھن سے، پڑی تلوار دھارا ہے
بھبوتی نام ہے میرا، عطائی پور میں ڈیرا
یہی ہے مئو کا کھیڑا، تلے گنگا کنارا ہے

(آرون جلد دوم ص 23)

317- یہ محض افواہ نکلی۔

318- اس کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ہر امیر اپنے محکمے کا انتظام بھی ایسے ہی کیا کرتا تھا جس

طرح سے سلطنت کا انتظام ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت افسر اوران کے ماتحت مزید افسر ہوا کرتے تھے۔

319- ''کیا ہی اچھا ہو کہ ایک کرشمے سے دو کام ہو جائیں۔''

320- ستائیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 30 مئی 1745ء بروز اتوار۔

321- حوضہ ہائے آہنی سے مراد زرہ بکتر ہے جس پر تیر و تلوار کا اثر نہیں ہوتا۔ یعنی امراء نے خود کو زرہ بکتر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا ہوگا۔

322- سن 1151ھ بمطابق 1738-39ء۔

323- قزلباش سے مراد نادر شاہ درانی ہے جو ایران کا بادشاہ تھا۔

324- یعنی نادر شاہ نے ہندوستان کو خوب لوٹا اور دہلی کا قتل عام تو مشہور ہے۔

325- ہمایوں یعنی بادشاہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کو میدان جنگ میں ہونا چاہئے۔

326- یعنی زمانے کی ہوا لگ گئی۔

327- یعنی عیش پسند ہو گئے۔

328- تو اپنے اچھے کام کی بلندی سامنے سے لے جا ورنہ نادانستہ کام مشورہ تو یہ ہے کہ کیا کریں؟

329- اٹھائیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق 31 مئی 1745ء بروز پیر۔

330- رام نارائن کن کٹا کا باپ آتما رام تھا جو ہنڈون و بیانہ کا فوجدار تھا۔ ذات کا مہتہ کھشتری تھا اور بھیروں وال کا ساکن تھا۔ وہ نواب برہان الملک کا دیوان مقرر رہا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ اول ہر نارائن دوم رام نارائن جو صفدر جنگ کا دیوان تھا۔ سوم پرتاپ نارائن جو پرتاپ سنگھ کر کے مشہور تھا۔ رام نارائن کے دو لڑکے تھے ایک مہاراجہ نارائن جو جنگ بکسر سے قبل شجاع الدولہ کا دیوان تھا۔ دوسرا ہردے نارائن۔ رام نارائن کا ایک کان کٹا ہوا ہوگا جو مخلص نے اسے ''بریدہ گوش'' تحریر کیا ہے (ڈاکٹر اظہر ص 71 حاشیہ 2)۔

331- انتیس ربیع الثانی 1158ھ بمطابق یکم جون 1745ء بروز منگل۔

332- جمدۃ کے معنی وزیر کے ہیں اور جمدۃ الملک سے مراد وزیر اعظم ہے۔ اگرچہ جمدۃ الملک کا خطاب وزیر الممالک کو نہیں ملا تھا اور نہ ہی کبھی کسی اور کو اس سے قبل ملا تھا۔ مگر مخلص نے

351- ”جوئے باز سے جو کچھ چھینا وہ حاضرین جوا خانہ کو بطور انعام دیا جاتا تھا۔“

352- ”وفادار دوست اور ہم دل شجاع۔“

353- چار جمادی الاول 1158ھ بمطابق 5 جون 1745ء بروز ہفتہ۔

354- پانچ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 6 جون 1745ء بروز یک شنبہ یعنی اتوار۔

355- چھ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 7 جون 1745ء بروز پیر۔

356- تبر دار یعنی کلہاڑا چلانے والے یا لکڑ ہارے۔

357- فرید الدین خان، سابق گورنر مراد آباد عظمت اللہ خان مراد آبادی کا بیٹا تھا۔

358- عظمت اللہ خان مراد آبادی ابن عصمت اللہ خان، لکھنو کے شیخ فاروقی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ بہت عرصہ مراد آباد کا گورنر رہا۔ اس کا باپ عصمت اللہ بھی اورنگ زیب کے دور میں یہاں کا گورنر رہا تھا۔ عظمت اللہ کے داؤد خان روہیلہ سے گہرے تعلقات تھے۔ داؤد خان ایک بار اپنے مالک کے ایماء پر عظمت اللہ کے مقابلے پر آیا مگر عظمت اللہ سے درون خانہ سازش پر اسے مضبوط کیا نتیجتاً اس کے مالک نے داؤد خان کو قتل کرا دیا۔ علی محمد خان اور باقی ماندہ روہیلے بعد ازاں عظمت اللہ خان کی ملازمت میں آ گئے اور کافی عرصے اس کے ساتھ رہے۔ عظمت اللہ خان نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور جاگیریں عطا کیں تھیں۔

359- عہد اکبری میں ایک کروڑ دام وصول کرنے والا کروڑی کہلاتا تھا۔ بعد ازاں یہ ”کروڑہ“ ہو گیا۔ ”بازار کے سربراہ“ کے لئے مخلص نے فارسی میں لفظ ”کروڑہ گنج“ استعمال کیا ہے۔

360- بنجارے اکثر لشکروں کے ساتھ رہتے تھے۔ نرخ گھٹانے بڑھانے میں انہیں بہت دخل حاصل تھا۔ یہ سراغ رسانی و خبر رسانی کا کام بہت تیزی اور خوش اسلوبی سے کیا کرتے تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں کی فتح کی خبر بادشاہ اکبر کو انہی کے ذریعے سے معلوم ہوئی تھی۔

361- سیر المتاخرین سے ثابت ہے کہ ”ملازمین کو قلعے میں مال و اسباب کی ضبطی پر مقرر کیا گیا۔ خوراک کا ذخیرہ...... بہت زیادہ ہاتھ آیا۔ کچھ چھوٹی توپیں اور اشیاء تھیں...... اس کے

علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ تھوڑا بہت جو قائم خان کے پاس رکھایا گیا تھا وہ ظاہر ہو گیا اور شاہی خزانے میں داخل کر لیا گیا۔

362- یعنی وزیر الممالک۔

363- قائم خان سے علی محمد خان کو اس بناء پر الگ کر دیا گیا کہ دونوں ہم قومی کی بناء پر کوئی نئی مشکل نہ کھڑی کر دیں اور تسلی کے لئے قائم خان کو "قائم الدولہ" کا خطاب دیا گیا۔

364- سات جمادی الاول 1158ھ بمطابق 8 جون 1745ء بروز منگل۔

365- تجھ سے دور ہو کر دل خانہ خراب کی جلن
میں عجیب کیفیت ہے، اے پھول، جلدی کر
میرا جگر جل رہا ہے اور میری آنکھوں سے
چراغ کی مانند پانی بہہ رہا ہے۔

366- چتر بھوج سے مراد دیوان ہے۔ یہ شخص راجہ جگل کشور کا دیوان ہوگا۔

367- جگل کشور قوم کا بھاٹ تھا اور دہلی میں مہابت جنگ صوبیدار بنگال کی جانب سے وکیل تھا۔ قائم جنگ کے مارے جانے کے بعد صفدر جنگ کی طرف فرخ آباد کا علاقہ لینے لگا مگر احمد خان بنگش کی سازش سے اپنے ہی ہاتھی تلے آ کر مارا گیا۔ (آرون، دوم ص 97) کنور پریم کشور فراقی جو خطاطی میں یکتا تھے ان ہی کے پوتے تھے۔ (ڈاکٹر اظہر ص 83 حاشیہ 2+3)۔

368- آٹھ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 9 جون 1745ء بروز بدھ۔

369- "انوپ شہر" دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر بلند شہر سے 25 میل مشرق میں ہے۔ ضلع بلند شہر لگتا ہے۔ یہ بہت مشہور تجارتی منڈی رہی ہے۔ 1901ء میں اس کی آبادی 8601 افراد پر مشتمل تھی۔ انوپ شہر جہانگیر کے دور میں بارگوجر قوم کے راجہ انوپ رائے نے بسایا تھا۔ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے س راجہ کی بہادری کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی اولاد تا حال وہاں پر موجود ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے 1757ء میں اسے چھاؤنی مقرر کیا تھا۔ اور پانی پت کی جنگ کے لئے مسلمانوں کی صف بندی اسی جگہ طے پائی تھی۔

(بلند شہر گزیٹیر ص 183-179)۔

370- نو جمادی الاول 1158ھ بمطابق 10 جون 1745ء بروز جمعرات۔

371- تال سے مراد تالاب ہے۔ کٹورہ وہ برتن ہوتا ہے کہ جس میں پانی پیتے ہیں۔ یہاں پر تال کٹورے سے مراد ایسے موزوں و متناسب تالاب سے ہے جو کٹورے کی طرح سے لبالب بلکہ قدرے بلندی پر ہو۔ نئی دہلی میں ایک علاقہ ایسا بھی ہے جہاں محمد شاہ بادشاہ شکار کیا کرتا تھا اور اس علاقے کا نام تال کٹورہ تھا۔

372- رانوٹی یا راوٹی چوکور شکل کے چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔

373- ''قلندری'' ایک مومی کپڑا ہوتا ہے جس کو خیمے کے اوپر ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے خیمہ بارش کے پانی اور سورج کی تپش سے محفوظ رہتا ہے۔

373A- مخلص کے پوتے کا نام ہے۔

374- بارہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 13 جون 1745ء بروز اتوار۔

375- تیرہ جمادی لاول 1158ھ بمطابق 14 جون 1745ء بروز پیر۔

376- مخلص نے لفظ ''مارد'' ہی استعمال کیا ہے یعنی ایسا بینگن جس نے جھگڑا کھڑا کر دیا اور نوبت مار پیٹ پر آ گئی۔

377- چودہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 15 جون 1745ء بروز منگل۔

378- موضع نگلی کا قابل ذکر شہر غالباً جدید دور میں ''ناگلہ بل'' نامی دیہات ہے۔ یہاں پر پٹھان بہت آباد ہیں۔ (بلندشہر گزیٹیر ص 272)۔

379- پندرہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 16 جون 1745ء بروز بدھ۔

380- رائے صاحب مجلس کے باپ نواب قمر الدین وزیر الممالک کے بخشی تھے۔ ان کا نام بھی مجلس رائے ہی تھا۔ نادر شاہ نے ان سے زر کثیر طلب کیا۔ نہ دے سکنے کے باعث خودکشی کر لی۔ (ڈاکٹر اظہر ص 93 حاشیہ 1)۔

381- اے چاند، نکل آ، ہم انتظار میں ہیں۔

382- اے سرو، آ جا، ہم انتظار میں ہیں
کھڑے ہو کر آ جا، ہم انتظار میں ہیں
آج کی رات چھت (آسمان) کے کنارے جلوہ ظاہر کر

اے چاند، آ جا، ہم انتظار میں ہیں
اے پھول، خواب نامے سے نواز
ابھی دیر ہے، ہم انتظار میں ہیں
بادل نہیں ہے، کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی
اے فیض ہوا، ہم انتظار میں ہیں
تیرا چہرہ (دیکھے) بغیر، باغ کی تفریح کرنا کفر ہے
جلد آ جا، خدا کی قسم، ہم انتظار میں ہیں
بادل اور رات اور موج کا خطرہ، اے خدا!
اپنا فضل دکھا کہ ہم انتظار میں ہیں
مخلص، تیری بات ذوق والی ہے
اپنا دیوان (شاعری کا) کھول دے، ہم انتظار میں ہیں

383- ماہتابی سے مراد وہ چھوٹی سی عمارت ہے یا بارہ دری ہے جو کسی حوض یا نہر کے کنارے چاندنی کی سیر کے لئے بناتے ہیں۔ یہاں یہ خیمے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (فیض اللغات فارسی ص509)۔

384- صحرا میں پھرنے والوں کی ضروریات کے مالک، کشتی
کبھی کبھی دریا کے اس کنارے نظر آتی ہے
کس طرح سے تو کامیاب ہویا جا سکتا ہے
کیونکہ نہ تو طاقت اور نہ ہی آہ وزار اور نہ ہی پیسے (کے لالچ) سے (کشتی) ادھر آتی ہے۔

385- صاف آسمان کا صفحہ بالکل بے قیمت ہے
اس پر کوئی یادگار بات تحریر کر دے۔

386- "کشتی" یعنی پہلوان زور آزمائی کرتے ہیں جسے کُشتی (ک پر پیش کے ساتھ) کہتے ہیں۔ یہاں مراد بحث و تکرار اور دھکم پیل ہے۔

387- کبت، ہندی زبان میں شاعری کو کہتے ہیں۔

کئی جگہ اس لفظ کو استعمال کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وزیرالممالک اس نام سے مشہور بھی تھا۔

333- راجہ خوشحال چند قوم کا کائیستھ تھا۔ نادر شاہ درانی نے اس سے پونے تین لاکھ روپیہ وصول کیا تھا۔ اس کا لڑکا گلاب رائے تھا۔

334- شاہی گولے ایک من آٹھ سیر اور ایک من سولہ سیر کے ہوتے تھے (آئین اکبری: بدائع وقائع سال بست وششم) اس سے ظاہر ہے کہ روہیلوں کے گولے دور تک مار نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ، شاید زیادہ سے زیادہ پانچ سیر کے ہوتے تھے۔

335- اس جگہ ایک تصویر تھی جو مخلص کے ایک ملازم گووردھن نے بنائی تھی وہ بہت اچھا مصور تھا۔ رام پور کے نسخے سے یہ تصویر کسی شخص نے پھاڑ لی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں بھی یہ تصویر نہیں ہے۔ خیال ہے کہ اس تصویر میں بہت سی تفصیلات دکھائی گئی تھیں۔

336- یعنی بادشاہ کی حکمرانی کے اٹھائیسویں سال کے جمادی الاول بمطابق جون 1745ء کے حالات۔

337- یکم جمادی الاول 1158ھ بمطابق 2 جون 1745ء بروز بدھ۔

338- قائم خان اور علی محمد کے تعلقات بہت قدیم اور گہرے تھے۔ دونوں کا تعلق روہیلہ گروہ سے تھا البتہ قائم خان روہیلہ کی جگہ بنگش لفظ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ خیال ہے کہ قائم خان نے علی محمد سے اندرونی سازش بھی کی تھی اور وزیرالممالک کا جھکاؤ بھی اس کی جانب تھا۔ علی محمد کے اہل خانہ قائم خان کے رسالدار شجاعت خان کے پاس مئو میں تھے۔

339- دیگر امراء (عمدہ دیگر) کا نام حذف کر کے مخلص نے وزیرالممالک کی کارگزاری نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

340- دو جمادی الاول 1158ھ بمطابق 3 جون 1745ء بروز جمعرات۔

341- تین جمادی الاول 1158ھ بمطابق 4 جون 1745ء بروز جمعہ۔

342- جانش خان بہادر کا اصل نام سید عباس خان تھا۔ وہ سید علی عرف نجیب علی خان ولد ابن میر ابوالخیر علی خان الکابلی حسینی کا بیٹا تھا۔ 1161ھ میں فوت ہوا۔ اس کے نانا کا نام شجاعت خان ابن جانش بہادر تھا۔ جو 1069ھ میں فوت ہو گیا تھا۔ اپنے وقت کے شجاعوں میں

شامل تھا۔ یہ وزیر الممالک کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کے حملے میں مارا گیا۔ اس وقت اس کی عمر 70 سال سے زیادہ تھی۔ (ڈاکٹر اظہر ص 75-76 حاشیہ 3)۔

343- یعنی بالغ نہ ہوئے تھے۔

344- متبنیٰ لڑکے کا تذکرہ قابل غور ہے۔ داؤد خان گوکے پٹھان تھا مگر وہ شاہ عالم خان کا متبنیٰ تھا۔ داؤد خان کے دو متبنیٰ تھے اول فتح محمد خان ذات برہمن جسے بچپن میں داؤد خان نے مسلمان کر کے اس کی پرورش کی۔ دوم علی محمد خان جسے بھی بچپن میں پال کر مسلمان کیا۔ اس کی قوم جاٹ تھی۔ علی محمد خان نے بھی راجہ کمایوں کے قبیلے کے ایک لڑکے کو متبنیٰ کیا جیسا کہ آنند رام کے بیان سے ظاہر ہے۔ اس کو بھی مسلمان کر لیا ہوگا۔ دیگر تاریخوں میں البتہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس بات پر تحقیق مزید کی ضرورت ہے کہ یہ متبنیٰ جس کا مخلص نے خصوصیت سے ذکر دیا ہے کون تھا۔ آیا وہ علی محمد کے 6 بیٹوں میں سے ہی ایک تھا یا پھر کوئی اور تھا جو مرور زمانہ سے گم نام ہو گیا۔

345- قائم جنگ اور روہیلوں کے درمیان ہم قومیت پر اتحاد قائم ہونے کا ایک اور ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے۔

346- شہر اور میدان کو حسرت بھری نگاہ سے آہ (کہتے ہوئے) وداع کیا۔
وہ اس طرح سے جاتا ہے کہ جیسی کوئی ناصح دنیا سے جاتا ہے۔

347- احمد زمان خان بہادر طالب جنگ سے مراد قائم جنگ کا بھائی احمد خان بنگش ہے۔ اور محمد عطاء خان سے مراد عطا اللہ خان برادر قائم جنگ ہے۔ کیونکہ ابھی علی محمد قائم جنگ کے ڈیرے سے نکلا ہی ہے جہاں پر قائم جنگ کے بھائی وغیرہ تھے۔

348- حدیقۃ الاقالیم میں حلیہ یوں درج ہے کہ:

> ''سفید رنگ کا آدمی ہے، قد درست ہے اور جسامت متوسط ہے۔ اس کی داڑھی تین انگلیاں لمبی ہے اور مونچھیں ہونٹ تک تراشی ہوئی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا اور سفید لباس پہنا ہوا ہے۔''

349- اللہ یار بلگرامی نے بھی کچھ ایسا ہی حال حدیقۃ الاقالیم میں درج کیا ہے۔

350- رانوٹی، مربع طرز کے چھوٹے سائز کے خیمے کو کہتے ہیں۔

388- پنڈت کیلاش چندر رام پوری کے مطابق مخلص سے اس کبت میں سہو ہوا ہے۔ ان کے نزدیک کبت یوں ہونا چاہئے۔

"ہاہا کرت، اودھو، آوت ہے ھیو، بندھوا جھون کہو جائے تہاتن میرے کی
گوکل توتج دیئی، متھر اسنکلپ کینی، بندرابن سونہہ، یعنی بھولے سُدھ کھیرے کی
کہت کوی دیندر، رہت اچاٹ ہم جب سودھے آوت برہ کے بسیرے کی
پیت کی چڑھائے ناؤ، کاٹی دیئی منجھار کتنی برج ناتھ، کدھون تھلکی نہ تیرے کی۔
(ڈاکٹر اظہر صفحہ 97 حاشیہ 2)۔

389- اس پانی کے گرداب میں ہزار کشتی بیچنا چاہیں
مگر کنارے پر کوئی تختہ بھی نہیں ملتا

390- مخلص کے محلے کا نام وکیل پورہ تھا۔

391- اٹھارہ جمادی الاول 1158ھ بمطابق 19 جون 1745ء بروز ہفتہ۔

391A- خربوزے کی طرح کا ایک میٹھا پھل ہوتا ہے۔

392- گجرولہ ایک دیہات ہے جو مراد آباد شہر سے 33 میل دور ہے۔ یہ تحصیل حسن پور ضلع مراد آباد میں ہے اور تجارتی منڈی رہی ہے۔

392A- یعنی نگران یا افسر۔

393- کٹرہ محلدار خان کے پاس ان مجلس رائے کا ایک باغ تھا۔ (اورینٹل کالج میگزین نومبر 1941ء صفحہ 121)۔

394- اصل فارسی یوں ہے کہ:

"نور چشم قدم رنجہ نمودہ میرزای مذکورہ کہ ریش و بروت تراشیدہ جوان
ہندوستان زای بک ہندی بودہ، ملاقات نمودند۔"

395- خواجہ مسرور، امیر الامراء خان دوران کا خواجہ سرا تھا۔ جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔ خان دوران اس دور کا امیر الامراء تھا۔ جس کی بیٹی کا نکاح یکم رمضان 1153ھ/20 نومبر 1740ء بروز دوشنبہ۔ اعتمادالدولہ وزیر کے بڑے بیٹے انتظام الدولہ سے ہوا (سیر المتاخرین، جلد دوم ص4)۔

396- سید جمیل الدین خان، فرخ سیر کے عہد کے میر جملہ نواب معظم خان خانخاناں کا داماد تھا۔ اور سیاست میں کافی اثر و رسوخ رکھتا تھا (مآثر الامراء، جلد دوم ص 107 اور 52-851، جلد سوم ص 890)۔

397- "تو بیٹھ، دشمنوں کے ساتھ مجلس گرم کر کیونکہ میں تو چلا۔"

398- پھل کا نام۔

399- تو سن لے ایک محمود غزنوی نے ایک رات
عیش کیا اور اس کی ساری رات پوستین (نرم ریشمی کپڑا) میں گزری۔
ایک فقیر نے وہ رات تنور کے کنارے گزاری۔
تنور کی رات اس ضرورت مند نے برہنہ گزاری۔
صبح اس نے نعرہ بلند کیا اور کہا کہ "اے محمود!
پوستین کی رات بھی گزر گئی اور تنور کی رات بھی گزر گئی۔"

400- انیس جمادی الاول 1158 ھ بمطابق 20 جون 1745ء بروز اتوار۔

401- تکری یا تگری تحصیل حسن پور ضلع مراد آباد میں ایک گاؤں ہے اور مراد آباد شہر سے 38 میل دور ہے۔ یہ عہد اکبری میں پرگنہ تگری کا صدر مقام تھا۔ یہاں پر تگا قوم کی آبادی تھی جس کے نام پر دیہات کا نام پڑ گیا۔

402- عبد الصمد خان یعنی زکریا خان جو سابق گورنر کا بیٹا تھا اور خود بھی گورنر تھا اور اعز الدولہ و حیات اللہ خان کا باپ تھا۔ زکریا خان وزیر الممالک کی بہن کا شوہر تھا۔ اس کے حالات اس سفرنامے کی ابتداء میں ایک حاشیے میں بیان ہو گئے ہیں۔ بیگم صاحب محل سے مراد غالباً زکریا خان کی بیگم اور وزیر الممالک کی بہن مراد ہے۔

403- بیس جمادی لاول 1158 ھ بمطابق 21 جون 1745ء بروز پیر۔

404- خرک فارسی میں گدھے کو کہتے ہیں۔ خرکلہ سے مراد غالباً چھوٹا گدھا ہے۔ (فیض اللغات فارسی ص 181)۔

405- "بھڑوے" گالی ہے جس کے معنی "بہن کو کرائے پر چلانے والا" ہیں۔ فارسی میں اس کے لئے لفظ "مردکہ ھا" استعمال ہوا ہے۔

406- بائیس جمادی الاول 1158ھ بمطابق 23 جون 1745ء بروز بدھ۔

407- غازی نگر اس سے مراد آج کا غازی آباد ہے۔ غازی آباد کو پہلے غازی نگر بھی کہتے تھے اور غازی الدین نگر بھی کہتے تھے۔ مخلص نے دونوں نام استعمال کر دیئے ہیں۔

غازی آباد 1740ء میں وزیر غازی الدین نے بسایا جو آصف جاہ کا بیٹا تھا اور حاکم دکن صلابت جنگ کا بھائی تھا۔ پہلے اسے غازی الدین نگر کہتے تھے مگر ریلوے شروع ہوئی تو اس کا نام مختصر کر کے "غازی آباد" کر دیا گیا۔ غازی الدین کی تعمیر کردہ ایک سرائے بھی یہاں پر موجود ہے۔ (میرٹھ گزیٹیر)

408- دریائے ہنڈن ایک بڑا دریا ہے جو میرٹھ، بلند شہر اضلاع کو سیراب کرتا ہے اور بعد ازاں دریائے جمنا میں مل جاتا ہے۔ اس کو کالی ندی بھی کہتے ہیں۔

409- سرائے بسنت کے نام سے ظاہر ہے کہ کسی بسنت نامی شخص کی سرائے ہوگی۔

410- غازی الدین نگر یعنی آج کا غازی آباد دیکھئے حاشیہ نمبر 407۔

411- تئیس جمادی الاول 1158ھ بمطابق 24 جون 1745ء بروز پنج شنبہ (جمعرات)۔

412- قیاس ہے کہ اس سے "گنج شاہدرہ" یا "دلی شاہدرہ" مراد ہے۔

413- اورینٹل کالج میگزین نومبر 1941ء صفحہ 121 پر درج ہے کہ "میں نے رائے کرپا رام اور......رائے فتح سنگھ و برادر مہربان لالہ لچھی رام اور عزیز القدر کشمیری مل وغیرہ دوستوں کو روانہ کر دیا۔"

414- سلخ (30) جمادی الاول 1158ھ بمطابق یکم جولائی 1745ء بروز پنج شنبہ (جمعرات)

415- بارہ رمضان المبارک 1158ھ بمطابق 10- اکتوبر 1745ء بروز یک شنبہ (اتوار) یہاں مخلص سے سہو ہوا ہے اور اتوار کی جگہ شنبہ یعنی ہفتہ پڑھنا چاہئے۔

416- 9 رمضان المبارک 1158ھ بمطابق 6- اکتوبر 1745ء بروز چہار شنبہ (بدھ)۔

* * *

پانچویں تاریخ کانفرنس کے شرکاء

پانچویں تاریخ کانفرنس کے شرکاء

پانچویں تاریخ کانفرنس کے شرکاء

سوانح عمری

کورش اعظم	ہیرلڈلیم	200/-
صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈلیم	300/-
عمر خیام	ہیرلڈلیم	200/-
منگول اور ان کا سردار	ہیرلڈلیم	100/-
سلیمان عالی شان	ہیرلڈلیم	250/-
ہینی بال	ہیرلڈلیم	170/-
بابر	ہیرلڈلیم	160/-
نور محل	ہیرلڈلیم	160/-
چنگیز خان	ہیرلڈلیم	100/-
سکندر اعظم	ہیرلڈلیم	240/-
امیر تیمور	ہیرلڈلیم	180/-
تاتاریوں کی یلغار	ہیرلڈلیم	200/-
قسطنطنیہ	ہیرلڈلیم	160/-
تین عظیم فاتح	ہیرلڈلیم	500/-
تین عظیم جنگجو سپہ سالار	ہیرلڈلیم	500/-
شاہ عبداللطیف بھٹائی	ایچ۔ ٹی۔ سورلے	250/-
تین عظیم ڈکٹیٹر	مرتب: اسلم کھوکھر	500/-
اتاترک	مرزا احمد دہلوی	130/-
وہائٹ ہاؤس کے مکین	سویدا حنا	250/-
دنیا کی نامور شخصیات	ایلن بلیک ووڈ	250/-
تاریخ ٹیپو سلطان	سید میر علی کرمانی	300/-
اورنگ زیب عالمگیر	شبلی نعمانی/ ڈاکٹر اوم پرکاش پرشاد	160/-
باطو خان	وائی یان	250/-
ابراہام لنکن	ڈیل کارنیگی	130/-

آپ بیتیاں

رسل کی آپ بیتی	برٹرینڈ رسل/ قاضی جاوید	240/-
میرے ماہ و سال	جاوید شاہین	100/-
آپ بیتی ول ڈیورانٹ اور ایریل ڈیورانٹ	ول ڈیورانٹ/ ایریل ڈیورانٹ	350/-
اس آباد خرابے میں	اختر الایمان	130/-
در در ٹھوکر کھائے	ڈاکٹر مبارک علی	100\-
باتیں لاہور کی	سوم آنند	130/-
تلاش حق	مہاتما گاندھی	250/-
اپنی کہانی	راجندر پرشاد	450/-
مشرق کی بیٹی	بے نظیر بھٹو	600/-
خانہ بدوش	اجیت کور	100/-
خواب باقی ہیں	آل احمد سرور	170/-
یادوں کی دنیا	یوسف حسین خان	180/-
اعمال نامہ	سر رضا علی	230/-
میری جدوجہد	ہرایڈولف ہٹلر	150/-
تزک ہٹلری	ہرایڈولف ہٹلر	450/-
داستان مسولینی	بینٹو مسولینی	150/-
گورکی کی آپ بیتی	میکسم گورکی	350/-
ٹالسٹائی کی آپ بیتی	لیو ٹالسٹائی	200/-
گیان سنگھ شاطر کی آپ بیتی	گیان سنگھ شاطر	350/-
خود گذشت	ڈاکٹر احمد محی الدین	120/-
لطف اللہ کی آپ بیتی	لطف اللہ	150/-
پنجاب کے سو سال	پرکاش ٹنڈن	150/-
بیرون پنجاب	پرکاش ٹنڈن	150/-
میری داستان	فرحت اللہ بیگ	200/-
غبار زندگی	حسن نواز گردیزی	180/-